انور سدید
کرم دم جستجو
مرتبہ
سجّاد نقوی

انور سدید

گرمِ دمِ جستجو

مرتّب
سجّاد نقوی

مکتبۂ اُردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا

ضابطہ

حقوق ---------- بحقِ مُصنّف محفوظ

طبع ---------- اوّل

ناشر ---------- نصرت انوار

مطبع ---------- ثنائی پریس سرگودھا

خطاطی ---------- صغیر شروانی

ماہ وسالِ اشاعت ---- فروری سنہ ۱۹۹۰ء

قیمت ---------- پچاس روپے

ترتیب

آغاز

یہ کتاب ڈاکٹر انور سدید کی ۶۱ ویں سالگرہ کے مبارک موقعہ پر شایع کی جا رہی ہے۔

اُردو ادب میں ڈاکٹر انور سدید ایک بے حد متنازعہ شخصیت ہیں۔ جہاں ان کے نظریۂ ادب سے اتفاق کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے وہاں ان کے مخالفین کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مخالفت اگر محض برائے مخالفت ہو اور نظری اختلاف کے بجائے شخصی اختلاف کی بنیاد پر قائم ہو تو اس سے بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے کبھی مخالفت برائے مخالفت نہیں کی اور نہ مخالفت کے معاملے میں کبھی پہل ہی کی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے کبھی ہجو اور دشنام کا راستہ بھی اختیار نہیں کیا جب کہ ان کے ادبی دشمن ہمیشہ یہ کام کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کو اللہ تعالیٰ نے اتنی ہمت اور قوّت عطا کر رکھی ہے کہ مخالفین کی باتوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ وہ مطالعہ، تحقیق اور تخلیق کا کام بھی بڑی سنجیدگی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں انہوں نے انشائیہ نگاری اور شاعری میں نام پیدا کیا وہاں تنقید کی زندہ رہنے والی کتابیں بھی تخلیق کی ہیں۔ ان کی بعض تنقیدی کتب تو اب کلاسک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں اور ابھی ان کی لکھی ہوئی درجنوں کتابیں زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے انہیں بجا طور پر ایک ادبی جنّ کا خطاب عطا کیا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع آخر کے اُردو ادب کی تاریخ میں انور سدید کا نام ایک منارۂ نور کی طرح نظر آتا ہے۔ وہ کتابیں لکھنے کے علاوہ طلبا کی رہبری کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تھیسس لکھنے والا شاید ہی کوئی طالب علم ہو جسے انور سدید صاحب کی ضرورت نہ پڑی ہو اور انور سدید ہیں کہ نہایت خندہ پیشانی سے ہر طالب علم کی رہنمائی کرتے اور اسے علمی ادبی مواد مہیا کرتے ہیں یہ ایک بہت بڑی علمی اور ادبی خدمت ہے۔

اس کتاب میں انور سدید کے بہت سے معاصرین نے ان کے علمی اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان کی شخصیت پر بھی مضامین لکھے ہیں مگر بہت سے مضامین تاخیر سے ملنے کے باعث اس کتاب میں شامل نہیں کئے جا سکے۔ انشاءاللہ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں انہیں شامل کر لیا جائے گا۔

سجاد نقوی

انور سدید

۱۹۴۶ء

۱۹۵۹ء

۱۹۶۵ء

۱۹۸۸ء

ہرچرن چاولہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ رام لعل۔ ہیرانند سوز۔ کرشن کمار طور۔ انور سدید
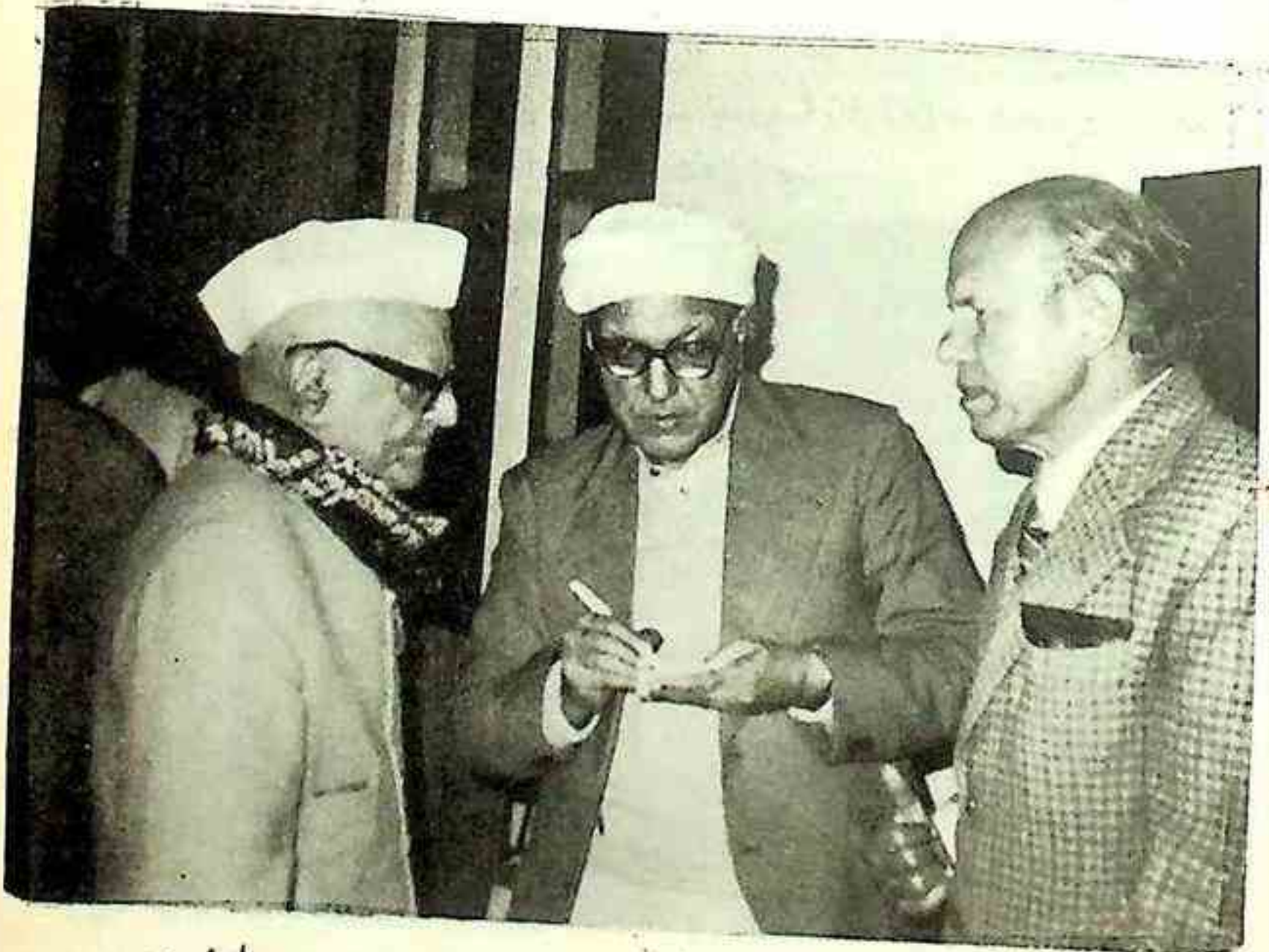
ڈاکٹر وزیر آغا　　انور سدید　　حیات اللہ انصاری
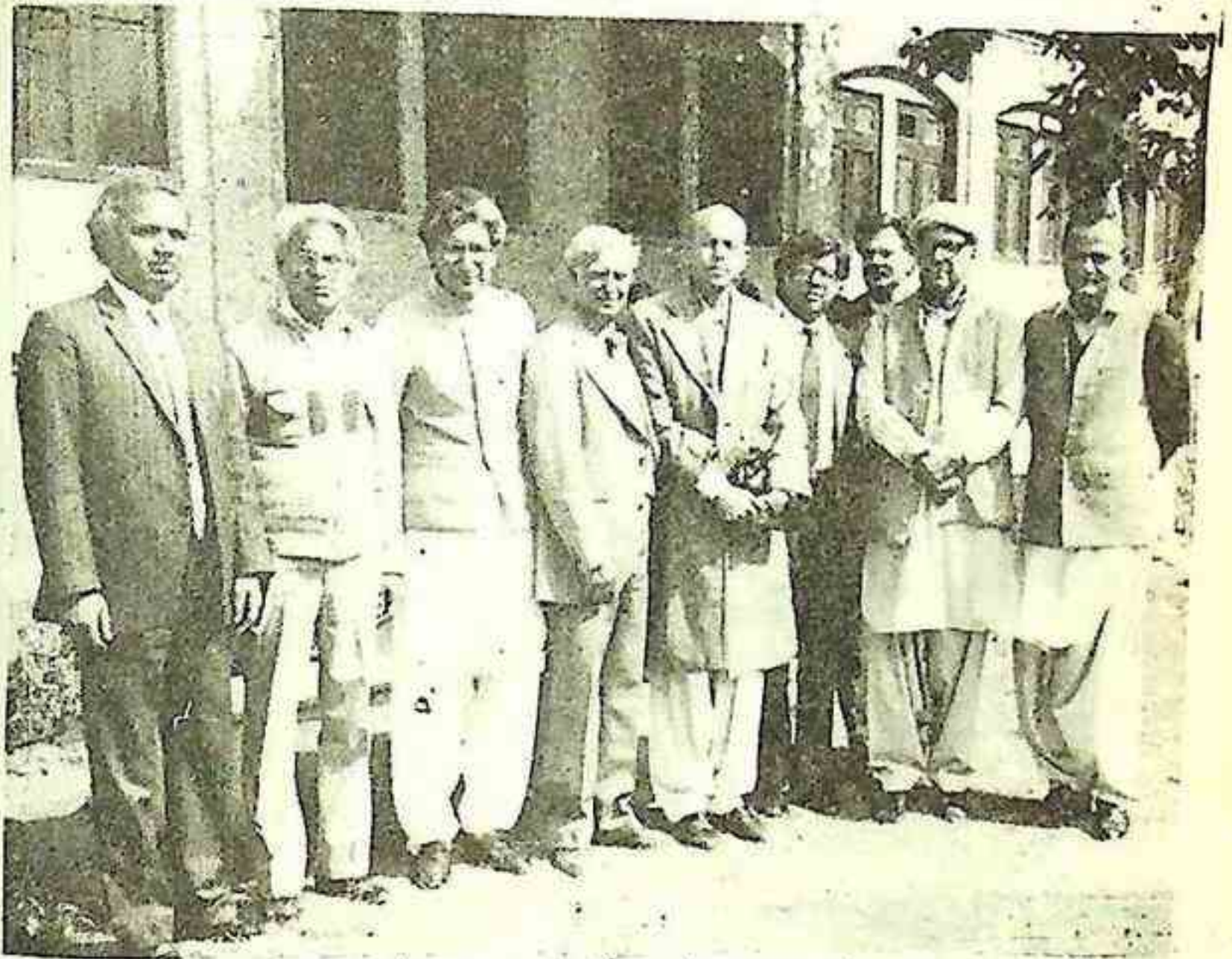
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن - انور سدید - ارشاد نقوی - ڈاکٹر صدیق جاوید - ڈاکٹر وزیر آغا - ہرچرن چاولہ
صابر لودھی ۔ اسرار احمد (گورنمنٹ کالج لاہور)

ظفر پیامی - جوگندر پال - انور سدید - نذیر صدیقی - ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے چند احباب (مالیگاؤں)
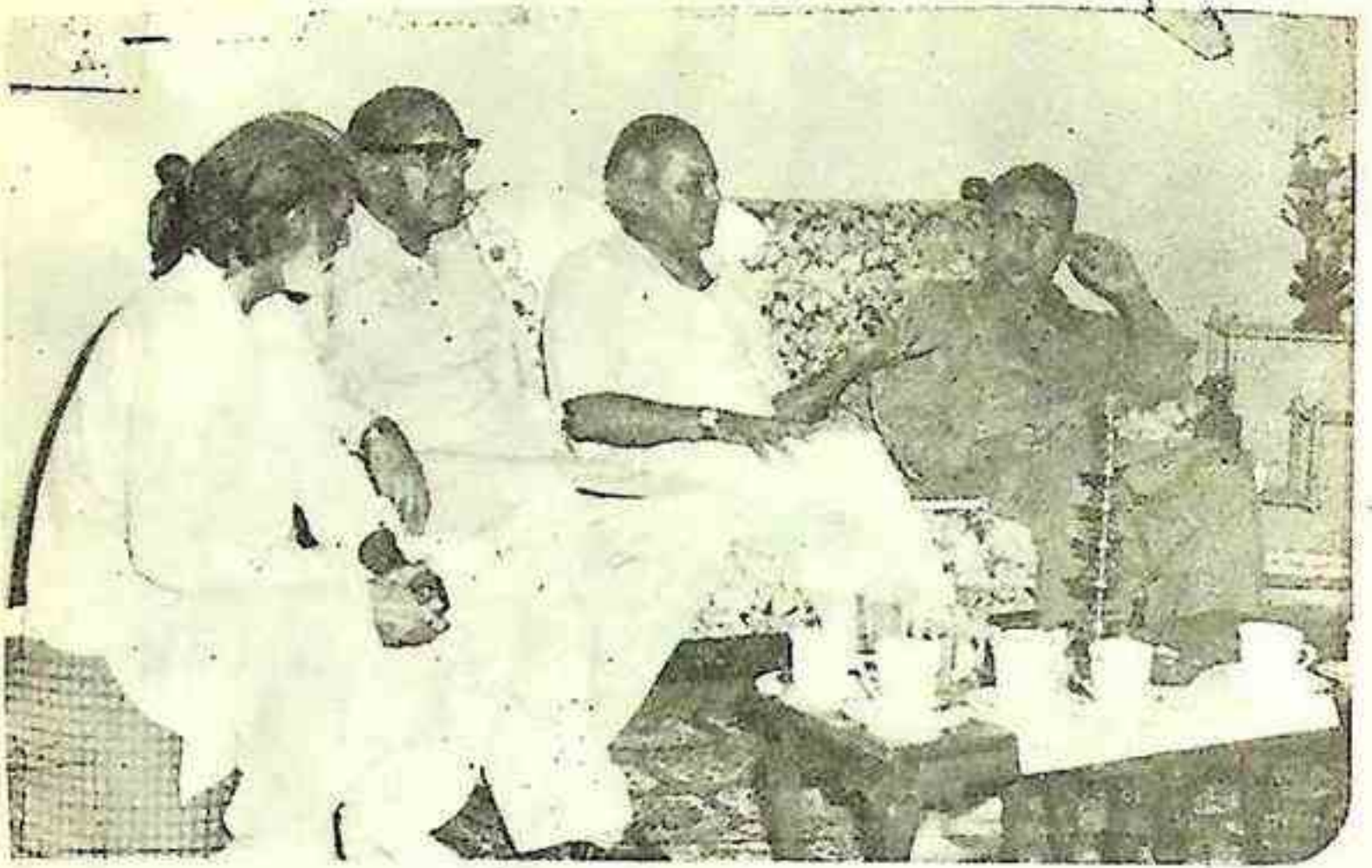
شہزاحمد ڈاکٹر نارنگ انور سدید غلام جیلانی اصغر (لاہور)
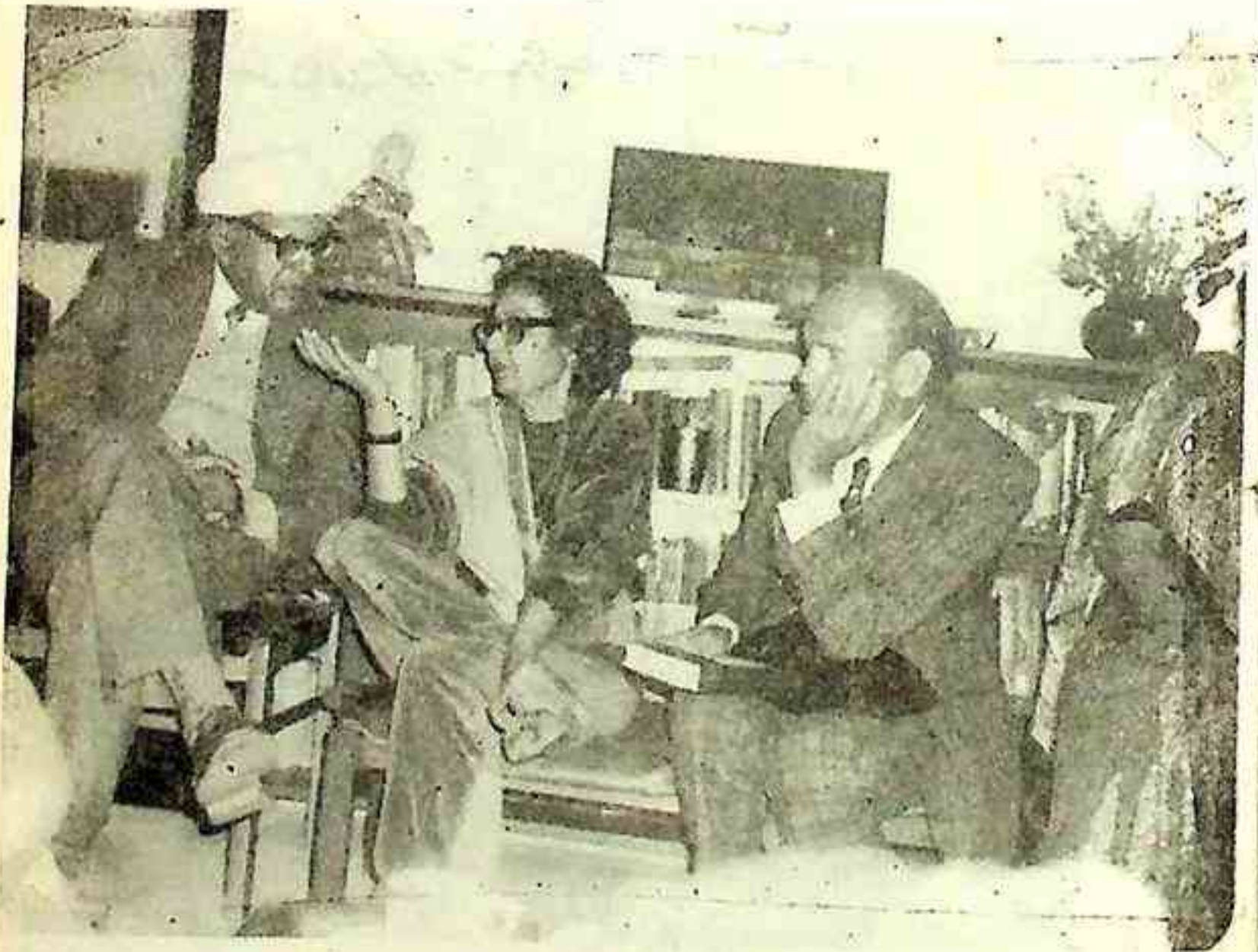
ڈاکٹر وزیر آغا قرۃ العین حیدر ڈاکٹر انور سدید (دہلی)

مسعود اشعر۔ صلاح الدین محمود۔ حنیف رامے۔ غالب احمد۔ اظہر جاوید۔ انور سدید (لاہور)

جوگندر پال۔ وزیر آغا۔ انور سدید (دہلی)

ایستادہ: ہرچرن چاولہ، ڈاکٹر نارنگ، انور سدید، وزیر آغا، شمیم حنفی، مجتبیٰ حسین
بیگم شمیم حنفی، کرشنال پال، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر جمیل جالبی (دہلی)

ڈاکٹر وزیر آغا، ظفر پیامی، ڈاکٹر انور سدید
(نئی دہلی)

ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر دوبے، جاوید طفیل (لاہور)

ممتاز مفتی کا مکتوب سجّاد نقوی کے نام

مکان ۲۲، گلی ۳۲
ایف ۶-۱/۱، اسلام آباد
مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء

جناب نقوی صاحب!

السلام علیکم۔ آپکا خط منشایاد نے آج بھیجا۔

نقوی صاحب میں نقد و نظر کی اہلیت نہیں رکھتا۔ الحمدللہ کہ نہیں رکھتا ـــــــ انور سدید کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوں۔ اس کے بارے میں لکھنے کی خواہش بھی ہے لیکن اس کی شخصیت کے بارے بہت کم معلومات رکھتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک مضبوط کردار کا مالک ہے۔ طاقت ور جسمانی بھی ذہنی بھی۔ ذہنی زیادہ، جبڑے تلے دبا ہوا عزم بہت رکھتا ہے۔ انگریزی میں ایسے آدمی کو IRON MAN کہتے ہیں۔ خمیر میں سنجیدگی کا جز و حاوی ہے۔ کچھ زیادہ ہی۔ دیکھو تو یوں لگتا ہے جیسے عمل حاوی ہے ویسے بہت علم رکھتا ہے پنجابی میں جو بہت پڑھا ہوا ہو اُسے گڑھیا کہتے ہیں۔ انور سدید گھڑ ئیا ہوا ہے۔ محنتی ہے۔ محنت کی نسبت مشقت زیادہ پسند ہے۔ وضاشعاری کی بیماری لگی ہوئی ہے۔ صحت مند ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا خود پر کئی ایک پابندیاں لگائے بیٹھا ہے۔ کاش کہ دنیائے ادب میں آوارہ ہوتا۔ میرے حق میں تعصب پال رکھا ہے۔ میں نے بارہا سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن سمجھنے والی شے نہیں۔ خود سمجھے تو سمجھے سمجھانے سے نہیں سمجھے گا۔

نقوی صاحب ان چار ایک باتوں سے مضمون تو نہیں بنتا۔ آپ یہ بتائیں کہ مہلت کتنی دیں گے۔

میں انور سدید کو ایک سوالنامہ بھیجوں گا۔ اگر اس نے کچھ مواد مہیا کر دیا۔ شاید ایک چھوٹا سا مضمون لکھ سکوں۔ پکّا وعدہ نہیں۔ اناپ شناپ لکھ کر میں انور سدید کو

ٹھگنا پسند نہیں کروں گا۔ آپس کی بات ہے میں اس سے ڈرتا ہوں ۔ یہ خط جواب طلب ہے۔

ممتاز مفتی

"اُردو اَدب کی تحریکیں" میں انور سدید نے

تاریخِ ادب کو تحریکوں کے حوالے سے جانچا تھا۔

اب انور سدید اُردو کی تاریخ کا عہد بہ عہد مُطالعہ، اصناف

اور اشخاصِ ادب کا نیا تجزیہ پیش کرتے ہیں!

مختصر تاریخ ادبیاتِ اُردو

از۔ ڈاکٹر انور سدید

ایک جامع مگر مکمّل کتاب جس میں آغازِ اُردو سے ۱۹۸۶ء تک کی ادبی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

میرزا ادیب

اُردو ادب کا جمال آفریں "مستری"

چند روز ہوئے مَیں ادب کی ایک مخلوط محفل میں حاضر تھا۔ مَیں نے اس محفل کو مخلوط بہ اعتبار جنس کے نہیں کہا۔ میری مراد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ وہاں مرد بھی شامل تھے اور خواتین بھی بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہاں ادب کے کئی مکاتبِ فکر کے لوگ جمع تھے۔ نہ جانے کسی صاحب نے انور سدید کو موضوعِ گفتگو کیوں بنا لیا۔ ایک دم ایسا ہوا گویا سب کے سب کسی خفیہ تحریک کے زیرِ اثر متحرک ہو گئے ہیں۔ اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اگر اُس نے اِس اہم موضوع پر کچھ نہ کہا تو اُس کی ادبی حیثیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ سلسلۂ گفتگو چل نکلا تو چلتا ہی گیا۔ میں ساری باتیں تو اپنے ذہن میں محفوظ نہیں کر سکا تھا۔ چند آرا ضرور محفوظ کر لی تھیں۔

ایک صاحب بولے "چھوڑیئے میاں! کس آدمی کا نام لیا ہے۔ یہ انور سدید نہیں، انور شدید ہیں۔ شدتِ بیان کے علاوہ ان میں ہے کیا؟"

دوسرے صاحب نے فرمایا: "انھیں وزیر آغا کے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ انھی کی قصیدہ نگاری کرتے رہتے ہیں۔"

تیسرے صاحب نے یوں زبان کھولی "یہ اپنی فضول حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔"

چوتھے صاحب بولے: "بڑی سطحی رائے دے رہے ہو۔ انور سدید تو سراپا ذہانت ہے۔ مجھے تو اس دَور میں اُن سے تیز تر لکھنے والا اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

ان کے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے انھوں نے اس رائے کی تائید کی اور اپنی طرف سے کہنے لگے۔ انور سدید کی جو مخالفت کی جاتی ہے۔ وہ مخالفت برائے مخالفت ہے۔ اگر یہ وزیر آغا گروپ کے آدمی نہ ہوتے تو تم انھیں گوہرِ نایاب تصوّر کرتے۔"

"گوہرِ نایاب"۔ ہونہہ۔" ایسے گوہرِ نایاب تو سڑکوں پر رُلتے پھرتے ہیں" یہ الفاظ انہیں صاحب کے تھے جو سب سے پہلے بول چکے تھے۔

مَیں نے محسوس کیا کہ معاملہ آپ سے تم پر آگیا ہے اور باتوں کی لہر تلخی کی ریت سے گراں بار ہونے لگی ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں مَیں بھی زد میں نہ آجاؤں، مَیں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے کھسک جاؤں اور مَیں نے یہی عقل مندی کی۔

اس گفتگو سے کم از کم ایک حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ انور سدید اُردو ادب کی ایک متنازع شخصیت ہیں۔ ان کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کرنے والے بھی ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی معقول تعداد موجود ہے جو ان کی ذات پر سخت سے سخت تنقید کرنا اپنا فریضہ گردانتے ہیں۔

تو انور سدید اُردو ادب کی ایک متنازع شخصیت ہیں۔ مگر اس وقت میرے ذہن میں ایک سوال اُبھر آیا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا ایک ایسی شخصیت جس کے متعلق لوگوں کی رائیں متضاد نوعیت کی ہوں۔ کیا ایک اہم شخصیت نہیں ہوتی۔ دیکھئے نا ہر شخص تو ادب کی ایسی شخصیت نہیں بن جاتا۔ لوگ عام شریف آدمی کے بارے میں تو سوچنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر ایک متنازع آدمی کے متعلق ضرور سوچا جاتا ہے اور ایسے آدمی کے بارے میں رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ جو متضاد رایوں کا محور بن گیا ہو۔۔۔

انور سدید کو آپ متنازع شخصیت کہہ کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپ کو یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ اس آدمی کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ اہمیت نہ ہوتی تو ہمارے نقادوں کے لیے ایک مسئلہ کیوں بن جاتا۔

انور سدید کی یہ اپنی اہمیت ہی تو ہے کہ ایک صاحب نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں انہیں مستری کہہ دیا تھا۔ انور سدید محکمہ انہار میں ایک اگزکٹو انجینئر ہیں۔ اپنے عہدے کے لحاظ سے سماج میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جن صاحب نے انھیں بزعم خویش مستری کہہ کر اپنے غم و غصّہ کا اظہار کیا تھا، انھوں نے اپنی

طرف سے تو انھیں حقیر بنا دیا تھا مگر ہوا یہ کہ جب انور سدید کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک مہربان نے انھیں مستری بنا دیا ہے تو مسکرانے لگے۔

خبر پہنچانے والوں کے لیے یہ معاملہ ایک معمّا بن گیا۔

"سدید صاحب! آپ مسکرا رہے ہیں" کسی نے استفسار کیا۔

"جی ہاں، میں مسکرا رہا ہوں۔ آپ از راہِ کرم میرا دلی شکریہ ان تک پہنچا دیں، جنھوں نے مجھے مستری کا خطاب دیا ہے۔"

استفسار کرنے والے صاحب اور ان کے ساتھی مزید حیران ہو گئے۔ سدید صاحب نے انھیں زیادہ دیر تک پریشانی میں دیکھنا پسند نہ کیا۔ کہنے لگے: "میں تو ان کا ممنون ہوں۔ انھوں نے میری قدر افزائی فرمائی ہے۔"

"مستری کہہ کر؟"

"جی ہاں، مستری کہہ کر۔ آپ نہیں سمجھ سکے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مستری ہونے کے ناتے میرا تعلق اپنے عزیز وطن کی مٹّی اور پانی سے ہے۔ دونوں زندگی کی بڑی نعمتیں ہیں۔ سوچئے جس آدمی کا واسطہ وطن کی ان دو بڑی نعمتوں سے ہو اسے اور کیا چاہئے۔ میں اسی پانی اور مٹّی کے ساتھ تعلق قائم ہونے سے حق حلال کی روٹی کھاتا ہوں۔"

میرا سوال یہ ہے کہ کیا ان صاحب نے انور سدید پر بات کرتے ہوئے یہ غلط کہا تھا کہ وہ سراپا ذہانت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک تیز ذہانت ہی ایسا نکتہ پیدا کرنے پر قادر ہو سکتی ہے۔ اب تو نہیں، سدید صاحب ایک مدّت تک خود کو مستری ہی لکھتے رہے۔ مزاحاً نہیں، بڑی سنجیدگی سے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ انور سدید کے ادب کی قدر و منزلت تو ضرور کی جاتی ہے مگر مخالفت میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ مخالفت کی اصل وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے یعنی وہ ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا راہنما مانتے ہیں۔ مجھے خبر نہیں کہ آخر اس میں قباحت کیا ہے۔ انور سدید ایک بار نہیں بار بار برملا کہہ چکے ہیں کہ وہ آغا صاحب کو اپنا ادبی راہبر مانتے ہیں کسی کو اپنا راہبر تسلیم کرنے میں برائی کیا ہے؟ ادب کے موجودہ دور میں جب گروہ بازی کے رجحان کا گراف بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر گروہ کا کوئی نہ کوئی گرو بنا ہوا ہے تو انور سدید

وزیر آغا کو گرو کہتے ہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ جب وزیر آغا کو گرو ماننے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو پتا نہیں وہ یہ کیوں نہیں کہتے۔ "ایں گناہ ہست کہ در شہر شما نیز کنند۔" ویسے یہ عرض کر دوں کہ اپنے گریبان میں جھانکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے بھی کہ گردن کو خم دینے سے اذیت ہوتی ہے اور زیادہ اذیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اپنے گریبان میں جھانکنے سے جو مکروہ منظر نظر آتا ہے اس سے جھانکنے والا خود ہراساں ہو جاتا ہے۔

انور سدید کی ذات کو رگیدا جاتا ہے تو وہ کچھ قابلِ ذکر ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے البتہ جب ان کے گروہ کے گرو پر ناروا تنقید کی جاتی ہے تو وہ خاموش نہیں رہتے ہاں ایک مثال ایسی ہے جب ہم نے انور سدید کو بھی خلافِ معمول مضطرب دیکھا تھا۔

ہم سب کے قابلِ احترام دوست جناب احمد ندیم قاسمی نے نہ جانے کیوں پچھلے دنوں انٹرویو دیتے ہوئے انور سدید کے متعلق کہہ دیا کہ وہ ان کا نام نہیں لینا چاہتے کہ اس سے ان کا منہ پلید ہو جائے گا۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ فقرہ پڑھ کر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ الفاظ ندیم صاحب کے ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ لفظ انہوں نے ہی کہے تھے۔ سدید صاحب نے ان کا نوٹس لیا اور شدّت کے ساتھ لیا۔ تلخی بڑھی اور بہت حد تک بڑھی۔

اس واقعے کے بعد پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے مجھے اتنا ہی دکھ ہوا جتنا ندیم صاحب کے مذکورہ فقرے سے ہوا تھا۔ ایک مشاعرے میں چند ایک نہایت غیر ذمہ دار افراد نے ندیم صاحب کو غزل پڑھنے سے روک دیا۔ مجھے اب کے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔

یہ دونوں واقعے انتہائی تکلیف دہ تھے اور ان کی یاد سے کام و دہن میں سمیت سی گھل جاتی ہے۔ مگر میں ایک بات جانتا ہوں اور اس کا اظہار بے کم و کاست کرتا ہوں۔ میں ادب کا ایک ٹیڑا طالب علم ہوں۔ اگر کہوں کہ میری ساری زندگی ادب ہی میں گزری ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہو گا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں ہر آن ہوائیں چلتی رہتی ہیں کبھی کبھی ان ہواؤں کے بعض جھونکوں میں خس و خاشاک

بھر جاتا ہے، لیکن یہ ہوائیں جب تاریخِ ادب کے رفیع الشان قصر کے قریب پہنچتی ہیں تو ہواؤں کے ساتھ چلتے ہوئے یہ جھونکے رک جاتے ہیں اور اپنا بوجھ گرا کر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ میں نے جن ہواؤں کا ذکر کیا ہے وہ اپنے ساتھ ہر مصنّف کے صرف خونِ جگر کی خوشبو اور اس کی شب و روز کی محنت کے پسینے کی نمی لے کر قصرِ ادب میں داخل ہوتی ہیں۔

تاریخِ ادب کسی مصنّف سے یہ نہیں کہتی کہ تم نے فلاں وقت مشتعل ہو کر فلاں شخص پر بے جا تنقید کیوں کی تھی۔ کیونکہ اشتعال کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے البتہ وہ یہ ضرور کہتی ہے کہ اگر معجزۂ فن لے کر آئے ہو تو بڑی خوشی سے میرے حوالے کر دو۔ میں اسے آنے والی نسلوں کو سونپ دوں گی۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ وقتی اشتعال میں جو کچھ کہا جائے اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ تاریخِ ادب کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

انور سدید کی مخالفت کرنے والوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ مختلف ناموں سے کراچی کے اخباروں میں مخالف گروپ کے لوگوں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ سچّی بات کہوں گا سدید صاحب کے اس رویّے پر مجھے بھی اعتراض ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ کوئی نقاب چہرے پہ ڈال کر کچھ لکھنا میرے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے۔ کوئی شخص کچھ لکھتا ہے تو اسے سامنے آکر اپنی تحریر کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ چھپنا نہیں چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں انور سدید میں تخلیقی صلاحیتیں بھرپور انداز میں ہیں۔ انہوں نے بہت تھوڑی مدّت میں اتنی اعلیٰ معیار کی کتابیں ادب کو دی ہیں کہ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ بسیار نویسی سے مصنّف کا ذہنی معیار اگر بہت حد تک تو نہیں کسی حد تک ضرور اور لازماً متاثر اور مجروح ہوتا ہے، مگر انور سدید کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ اس قسم کی کالم نگاری پر کیوں اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں ضائع کریں۔

چند ماہ سے سدید صاحب کے کالموں کی نقلیں مجھے دستیاب نہیں ہو رہیں۔ میری دلی تمنّا ہے کہ انھوں نے یہ کالم لکھنے بند کر دیے ہوں۔

انور سدید بالعموم مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ دبی دبی ہوتی ہے۔ ہلکی ہلکی تاریٔ حریر کی طرح۔ آپ ان کے دفتر میں تشریف لے جائیں تو اپنے فائلوں میں کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، مسکراکر آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ پچھے دادر.. باتوں سے انھیں الرجی ہے۔ مختصر گفتگو کریں گے اور خاطر تواضع کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ان سے گھر پر ملاقات کریں تو آپ کو کم و بیش دس بارہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ آئیں گے تو اس معذرت خواہی کے ساتھ کہ معاف کیجئے ایک بڑا اہم کام کر رہا تھا۔ سمجھ لیجئے کہ وہ کوئی مضمون مکمل کر رہے ہوں گے۔ مضمون مکمل کیے بغیر اپنے کمرے سے باہر نکلنا ان کے لیے مشکل ہے۔

تیسری جگہ جہاں ان سے ملاقات ہوتی ہے وہ کوئی تقریب ہوتی ہے۔

اگر دعوت نامے میں تقریب کا وقت پانچ بجے شام چھپا ہوتا ہے تو سدید صاحب تقریب کے ہال میں داخل ہونے والے پہلے شخص ہوں گے۔ تقریب ختم ہوگی تو ان کا اپنا مخصوص پروگرام شروع ہو جائے گا۔ تقریب میں جتنے لوگ بھی وہاں ہوں گے ان سے فرداً فرداً ملیں گے۔ نتیجہ یہ کہ تقریب کے ہال سے باہر نکلنے والے وہ آخری آدمی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں میں انور سدید سے زیادہ وقت کا پابند کسی کو نہیں پایا۔ سات بجے آندھی آئے یا موسلا دھار بارش ہو رہی ہو وہ دفتر کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات میں نے یہ سوچ کر کہ موسم بڑا خراب ہے سدید صاحب ابھی گھر پر ہوں گے انھیں ٹیلی فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ پانچ منٹ پہلے دفتر جا چکے ہیں۔ خیال رہے کہ میں نے سات بجکر پانچ منٹ پر فون کیا تھا۔

ہر کام وقت کی پابندی اور تنظیم کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ پڑھنے کے وقت ان کے ہاتھ میں کتاب ہوگی اور لکھنے کے وقت قلم۔ کتاب کی جگہ قلم نہیں لے سکتا اور نہ قلم کی جگہ کتاب لے سکتی ہے۔

بے تحاشا پڑھتے ہیں اور بے تحاشا ہی لکھتے ہیں۔ اور حافظے کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کی نظروں سے گزر جاتا ہے وہ اپنے نقوش حافظے پر مرتسم کر کے جاتا ہے۔ ایک بار میں نے تہیہ کر لیا کہ مطالعے کے معاملے میں انھیں زچ پہنچاؤں گا۔ بھارت کے ایک بہت حد تک غیر معروف پرچے میں چھپے ہوئے ایک معروف قلم کار کے مضمون کا ان سے

ذکر کر دیا۔ سوچا تھا مجھ سے مضمون کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کچھ کہیں گے، مگر صاحب! وہ نہ صرف مذکورہ مضمون پڑھ چکے تھے بلکہ اس کا ذکر بھی اپنے ایک مضمون میں کر چکے تھے جو ابھی غیر مطبوعہ حالت میں ان کے پاس پڑا تھا۔

سدید صاحب، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ محکمہ انہار میں اگزیکٹو انجنیر ہیں اگزیکٹو انجنیر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اچھی خاصی بڑی افسری ہوتی ہے۔ لیکن سدید صاحب کو اس افسری پر بالکل ناز نہیں ہے۔ کہتے ہیں یہ تو میرا اور میرے بچّوں کے لیے رزق روٹی کا ایک ذریعہ ہے۔ بس! البتہ میں نے جو تیرہ کتابیں لکھی ہیں یہ میرا اصل کام ہے۔

سدید صاحب، واقعی اپنے ادبی کام کو اپنی متاعِ گراں بہا کہتے ہیں۔ بلکہ وہ اسے عبادت تک کا درجہ دیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک روز کہنے لگے:

"روزِ قیامت میرے اعمال کی پُرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کر دوں گا اور کہوں گا یہی میرا نامۂ اعمال ہے"

"اور اگر اللہ میاں نے یہ نامۂ اعمال قبول نہ کیا تو" میں نے سوال کیا۔

مسکرا کر بولے "نہیں میرزا صاحب! اللہ میاں بے ذوق نہیں ہیں۔ وہ کوئی متعصب اور تنگ نظر نقاد بھی نہیں جنھیں صرف اپنوں کی تحریریں ہی پسند آتی ہیں اور دوسروں کی تحریروں میں سو سو کیڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ میری عبادت قبول کر کے مجھے داخلِ بہشت ہونے کی اجازت دے دیں گے"

سدید صاحب! بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ میں ان کی خوبیاں گنواؤں گا نہیں۔ ایک خوبی کا اظہار ضروری ہے۔ سدید صاحب ایک قناعت پسند آدمی ہیں اور یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے کبھی قدرت کی کم بخششوں کا گلہ کیا ہے اور نہ ابنائے روزگار کی شکایت ہی کی ہے۔ اپنی تنخواہ سے بچا بچا کر جو رقم جمع کی ہے اس سے ایک چھوٹا سا مکان اپنے اور بیوی بچّوں کے لیے تعمیر کروا سکے ہیں۔ اور خوش ہیں کہ رہنے کے لیے ایک مکان موجود ہے۔ ہوٹل میں بیٹھنے اور لذیذ کھانے کھانے کا انہیں کوئی شوق نہیں۔ سیر و سیاحت سے بھی کوئی ایسی دلچسپی نہیں۔ نظم و نسق اور باقاعدگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔ روزمرّہ کی مصروفیات ان کے لیے بارِ خاطر

نہیں بنتیں۔ میں جب بھی انھیں دیکھتا ہوں۔ ان کے چہرے پر قلبی اطمینان کی روشنی ہی پاتا ہوں ـــ انور سدید ایک انتہائی مطمئن انسان ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ان کی ذات پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے: ؎

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

زندگی تو بہر صورت انسان گزار ہی لیتا ہے۔ بیدل نے کیا خوب کہا ہے۔

زندگی در گردنم افتادہ بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن!

انور سدید اس شعر کے مصرعِ ثانی کے دوسرے حصے کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں۔ ناشاد باید زیستن کیوں؟ انسان نے اگر خداداد صلاحیتوں سے بہتر کام لیا ہے اور خلقِ خدا کو کسی نہ کسی ذریعے سے کچھ دیا ہے تو زندگی شاد ہے اس کے ناشاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں اپنی اس تحریر میں پھر پیچھے جا کر اس حصے تک پہنچ جاتا ہوں جہاں انور سدید کو مستری کہا گیا ہے۔ سدید صاحب خود بھی اپنے آپ کو مستری کہنے اور کہلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ادب کو اگر تاج محل سمجھ لیں اور قلم کار کو ایک مستری تو مستری ہی اس تاج محل کی تعمیر میں کسی نہ کسی طرح حصّہ لیتا ہے اور اس کی آرائش و زیبائش میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ خود بھی تاج محل کے حُسن و جمال میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور انور سدید نے بھی اُردو ادب کے تاج محل کے بنانے سنوارنے اور اس کے سنگِ مرمر پر خوبصورت اور دل آویز نقش و نگار ابھارنے کی کامیاب اور قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ اس لیے میں انھیں مستری کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا ـــ وہ اُردو ادب کے تاج محل کے جمال آفریں مستری ہیں۔ اور یہ حیثیت انھیں بہت بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

فاضل اس کے جلوس میں شامل تھے یا اس کے تماشائی تھے۔ اس لباسِ عُریانی کی تعریف میں رطب اللسان تھے البتہ ایک بچہ نہ رہ سکا، وہ بے اختیار بول اٹھا۔ "لیکن یہ تو ننگا ہے۔"

انور سدید نے اس جلوس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے ارتقائی سفر میں ایک نقّاد کی حیثیت سے اس کا تماشا کیا ہے۔ 'روزنِ دیوار سے نہیں' کُھلے عام شاہراہوں سے، اس نے شروع میں اسے قابلِ اعتنا نہ جانا اور مہمل افسانے کو جدید افسانے کا نام نہ دیا۔ ہاں جب اس افسانے میں ابلاغ کی کچھ صورت پیدا ہوئی تو اسے اس میں کچھ زندگی نظر آئی۔ اس کا ثبوت اس کے مضمون "علامتی افسانہ۔ ایک منفی رجحان" سے ملتا ہے۔ اصل میں یہ اسی موضوع پر ڈاکٹر جمیل جالبی کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

انور سدید نے جدید افسانے کو 'علامتی + تجریدی' کہا ہے اور اس کے ارتقائی مراحل کو نہایت فطرتی اور منطقی انداز میں بیان کیا ہے اور جدید افسانے کے وہ اوصاف بیان کیے ہیں جو اسے قدیم افسانے سے جدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا مؤقف ہے کہ "جدید افسانہ" ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد وجود میں آیا۔ انور سدید اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے فارمولا افسانے کے خلاف رَدِّعمل نے نئے افسانے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔" اور یہی نظریہ درست معلوم ہوتا ہے۔

تاہم وہ افسانہ جسے تجریدی افسانے کا نام دیا جاتا ہے اس صدی کے ساتویں عشرے میں فروغ پذیر ہوا۔ انور سدید لکھتا ہے:

"نیا افسانہ نگار اپنے آپ کو نئے زمانے کی حیثیت سے الگ نہیں کر سکتا اور اس کے صادق اظہار کے لیے وہ اظہار و اسلوب کے نئے نئے سانچے تراشتا اور فن کی ایک نئی تمثیلی، تجریدی یا علامتی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

اس نسل کے افسانہ نگاروں کی انور سدید نے جو فہرست دی ہے اس میں انور سجّاد اور رشید امجد کا ذکر نہیں۔ گویا یہ دونوں پچھلی دہائی کے افسانہ نگار قرار دیے گئے ہیں۔ اگرچہ انور سجّاد اور رشید امجد عام بیانیہ انداز کا افسانہ لکھتے لکھتے اس 'دلدل' میں آ پھنسے کہ ان کا افسانہ مبہم سے مہمل بن گیا، تاہم انور سجّاد اپنی ڈگر پہ قائم رہے اور اب تک ہیں۔ اور رشید امجد کو پیر ٹکانے کے لیے زمین پہ آنا ہی پڑا۔ اَب اِن کے افسانے کو "کہانی پن" نے ڈھانپ لیا ہے۔

انور سدید نے اپنے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ علامتی افسانہ منفی رُجحان نہیں بلکہ یہ قدیم روایتی افسانے کی توسیع ہے جس سے معانی کی نئی ابعاد اور اظہار کے نئے قرینے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو شکایت ہے تو اس نسل سے جو آٹھویں دہائی میں سامنے آئی۔ ان کا خیال ہے کہ "اس نسل کا اپنی روایت سے کوئی گہرا رشتہ نہیں۔ یہ نسل نہ صرف انتشار کا شکار ہے بلکہ یہ انتشار میں مرکزیت تلاش کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔"

انور سدید نے اس انتشار کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کا ذمے دار نئی نسل کو قرار نہیں دیا۔ وہ کہتا ہے: "نئی نسل اس انتشار (عالمی) کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے، پس اگر کہا جائے کہ ہم نے نئی نسل کو جو ماحول دیا ہے، اس میں شکست و ریخت کا عمل تو تیزی سے ظہور پذیر ہو رہا ہے، لیکن نئی تعمیر کی صورت نظر نہیں آتی تو یہ غلط نہیں ہوگا۔"

اگرچہ جدید افسانے کے دفاع میں بہت سے نقادوں نے مضمون لکھے ہیں لیکن اس افسانے کی تائید و حمایت میں اس سے زیادہ زوردار اور قائل کرنے والا مضمون کسی اور نقاد نے کیا لکھا ہوگا۔ انور سدید کا انداز منطقی ہے اور اس میں جدید افسانے کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں مثلاً عصری آگہی اور جدید علامتوں کی تشکیل و تخلیق وہ ہر زندہ اور متحرک صنفِ ادب کا خاصہ ہیں۔ اس مضمون میں انور سدید نے جدید افسانے کے جو معیار مقرر کیے ہیں ان پر دو تجرید نگاروں یعنی رشید امجد اور عرش صدیقی کے فن کو بھی پرکھا ہے۔ اس پرکھ سے جدید افسانے کے اور کئی پرت روشن ہوتے ہیں۔

انور سدید کہتا ہے: "جدید افسانہ صرف کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ زندگی کا حقیقی نقّاد بھی ہے اور اس عمل میں چونکہ اس نے انحراف کا رویّہ بھی اختیار کیا ہے، اس لیے اسے اپنی آواز پُرانے کانوں میں اتارنے میں خاص دقّت ہو رہی ہے"
کان تو انور سدید کے پرانے ہیں اور میرے بھی۔
انور سدید کے کان ایک حسّاس نقّاد کے ہیں اور میرے کان ایک افسانہ نگار کے۔
اس کے کان نے جدید افسانے میں زندگی کی حقیقت کی آواز سُن لی ہے۔
لیکن میرا کان ابھی اس کی سماعت سے محروم ہے۔
"ایک زمانے میں شکایت پیدا ہوئی تھی کہ افسانے سے کہانی غائب ہو گئی ہے لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ جدید افسانہ قدامت قبول کیے بغیر کہانی کو اپنے بطن سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا"
یہ ایک نوید ہے جس سے میرے دل میں امید کی شمع روشن ہو گئی ہے۔
یعنی کہانی کے بن باس کی مدّت ختم ہو گئی ہے اور وہ اب لوٹ کر گھر آ گئی ہے
جدید افسانے میں کہانی پوری طرح لوٹ آئی تو انشاء اللہ میرے بوڑھے کان بھی زندگی کی حقیقی سُر کو سُن لیں گے کیونکہ میرے نزدیک افسانے میں "زندگی کی حقیقت" صرف صرف کہانی پن کے توسط ہی سے پیش ہو سکتی ہے!
مضمون اس 'نکتے' پر ختم ہو سکتا تھا۔
لیکن چند ضروری باتیں رہ گئی ہیں اور ان کے بغیر مضمون ادھورا رہ جاتا — عرض کرنے کا مدّعا یہ ہے کہ انور سدید نے افسانے کے نئے مباحث پیدا کر کے افسانے کی تنقید کو پڑھنے کی لذیذ چیز بنا دیا ہے۔ مَیں اُس سے اختلاف کر سکتا ہوں — — اور کرتا رہوں گا لیکن اس کی تنقید کا مطالعہ ترک نہیں کر سکتا، نہ اس کے تصوّرات کو نظر انداز کر سکتا ہوں کہ وہ افسانے کا اہم نقّاد ہے اور مَیں اس کی رائے کو وقعت دیتا ہوں۔
انور سدید نے افسانے کی نظری تنقید کے ساتھ ساتھ عملی تنقید کے بھی عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ اس نے اکثر اوقات ایسے افسانہ نگاروں کی انفرادیت دریافت کی ہے جنھیں تنگ نظر نقّادوں نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور افسانے پر

مضمون لکھ کر وغیرہ وغیرہ کی رسّی سے بھی باندھنے کی زحمت گوارا نہ کی - افسوس کہ اُردو کے اکثر نقّاد تنگ نظر بھی ہیں اور زمانہ ساز بھی - ان کی اپنی کوئی رائے نہیں اور وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہنس کے پَر لے کر اپنی "زاغیت" کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں - ترقی پسند اقتدار میں ہوں تو وہ ترقی پسند بن جاتے ہیں اور اگر زوال پسندوں کا جھنڈا بلند ہو تو وہ اس کے نیچے آ کھڑے ہوتے ہیں مانگے تانگے کے نظریات سے ان کے تنقید کے کشکول میں طرح طرح کے ٹکڑے نظر آئیں گے - باسی - بدبُودار اور متعفّن -

الحمد للہ کہ انور سدید اس قبیل کے تنقید نگاروں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے بلاشبہ وہ یاروں کا یار ہے لیکن یاری دوستی میں وہ ڈنڈی نہیں مارتا - میں کسی نقّاد کو صد فی صد غیر متعصّب نہیں پاتا اور نہ ایسا ہونا چاہئے - ہر اصلی نقّاد اپنا ایک تعصب (جھکاؤ) ضرور رکھتا ہے - انور سدید کا جھکاؤ بھی واضح ہے لیکن اسے جہاں کہیں 'جوہر' نظر آتا ہے، وہ اس کی تعریف سے اپنے آپ باز نہیں رکھ سکتا - وہ قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری کی تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ مرحوم کبھی سی - ایس - پی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ایک اصلی افسانہ نگار تھے - اس نے رام لعل، رحمٰن مذنب اور غلام الثقلین نقوی کی افسانہ نگاری پر بھی مضمون لکھے حالانکہ ان میں سے کوئی سی - ایس - پی نہیں یا ان کی ذات میں کوئی NUISANCE VALUE ہے کہ جس سے اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو - غلام الثقلین نقوی کو ان کے رفیقِ کار اور ایک زمانے میں دوستی کا دَم بھرنے والے نقّاد نے صرف اس لیے "افسانہ نگاروں" کی فہرست سے خارج کر دیا کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کا دوست تھا - اس کے برعکس انور سدید افسانہ نگار کو افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھتا ہے، دوستی یا دشمنی کے معیار پر نہیں پرکھتا - اس کی مثال میرزا ریاض مرحوم ہیں جن کی ہر اچھی کہانی کی اس نے تعریف کی حالانکہ "وزیر آغا انور سدید دشمنی" میں مرحوم اس کینہ جُو نقّاد کے ہمنوا تھے -

انور سدید نے شمس آغا، رحمٰن مذنب، جمیلہ ہاشمی، فرخندہ لودھی،

سیدہ حنا، عذرا اصغر، عرش صدیقی اور سلطان جمیل نسیم جیسے افسانہ نگاروں پر مقالات لکھ کر ان کے فن کے منفرد گوشے دریافت کئے ہیں۔ انھیں کے پہلو بہ پہلو غلام عبّاس مرحوم اور اشفاق احمد بھی ہیں کہ جن پر لکھے ہوئے مقالات کے متعلق میرا دعویٰ ہے کہ ایسے جامع اور منفرد مقالے ان افسانہ نگاروں کے فن پر اور کسی نقّاد سے بن نہیں آسکے۔ اسی قسم کے مضامین میں انور سدید کا مضمون "رام لعل اور اُردو افسانہ" چیزے دیگر ہے۔ اس میں انور سدید کا موضوع رام لعل کا افسانہ ہے لیکن موضوع کے تناظر میں رام لعل کی پوری افسانوی زندگی سمٹ آئی ہے۔ یہ بھی نہایت جامع اور منفرد مقالہ ہے کہ جس میں رام لعل کا فن ہی نہیں، خود وہ رام لعل بھی سامنے آتا ہے کہ جس کی افسانے کے ساتھ کمٹمنٹ بہت مضبوط اور اٹوٹ ہے۔

آخر میں مجھے انور سدید کے سالانہ افسانوی جائزوں کا ذکر بھی کرنا ہے۔ مجھے اُس کے اس قسم کے جائزے کا ہر سال انتظار رہتا ہے۔ مَیں ہی نہیں، ہر وہ افسانہ نگار جس نے سال میں ایک ہی افسانہ لکھا ہو، اسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرا نام اس جائزے میں ضرور آئے گا خواہ اس کا افسانہ "فنون" ہی میں کیوں نہ چھپا ہو۔ اس کے برعکس ایک جائزہ نگار ایسے بھی ہیں جو "اوراق" میں چھپنے والے افسانہ نگاروں کا ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ دشمنی ہو تو ایسی!

انور سدید کا جائزہ افسانہ نگار کے دل میں افسانے سے وابستگی کو اور بھی بڑھاتا ہے۔ اس کی رائے پڑھ کر خوشی ہوتی ہے اور لکھنے کی تحریک بھی ملتی ہے جس سال مَیں کوئی افسانہ تخلیق نہ کر سکوں، افسوس ہوتا ہے کہ اس سال انور سدید کے جائزے میں میرا ذکر نہیں ہو گا لیکن انور سدید میرا نام بھولتا نہیں اور مجھے غیر حاضر افسانہ نگاروں کی فہرست میں درج کر دیتا ہے۔ مَیں اس کا ممنون ہوں کہ وہ مجھے ادبی دنیا میں حاضر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

تن آسانوں کو مہمیز لگا کر انھیں فعال بنانا بھی تو ایک نقّاد کے فرائض میں داخل ہے یا سلیم اختر اور وارث علوی کی طرح ہدف بنانا اور ادیب کے بخیے ادھیڑنا ہی تنقید کا خاصہ ہے؟

اس کے جائزے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں اُردو افسانے کے صرف آفتابوں اور ماہتابوں کا ذکر ہی نہیں ہوتا بلکہ افسانے کے ننھے منے جگنوؤں کو ان کی صلاحیت اور فن کی اساس پر نمایاں کیا جاتا ہے۔ بہت سے نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا علم مجھے انور سدید کے جائزے سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں میں یہ افسانے پڑھتا ہوں تو اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس طرح کئی نئے افسانہ نگاروں کو انھوں نے افسانوی دُنیا سے متعارف کرایا ہے۔ اگلے سال یہی افسانہ نگار پہلے کی نسبت زیادہ اچھے اور زیادہ تعداد میں افسانے لکھتا ہے اور نام پاتا ہے۔

ایک ادبی محفل میں ایک نئے افسانہ نگار نے ان کا شکریہ ادا کیا تو انور سدید نے کہا: "شکریہ کس بات کا۔ آپ نے اچھا افسانہ لکھا۔ میں نے جائزے میں اس کا ذکر کر دیا۔ کبھی کرشن چندر اور منٹو بھی تو نوآموز تھے۔ مولانا صلاح الدین ان کا حوصلہ نہ بڑھاتے تو وہ فن کی بلندیوں پر کیسے پہنچتے؟"

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ انور سدید نے مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مشن کو سنبھال رکھا ہے۔ وہ تحسینِ سخن شناس سے کئی شاہین زادوں کو اونچا اڑنے کا فن سکھا چکے ہیں۔

فضیل جعفری نے اپنے دلی کینے کا اظہار کرتے ہوئے ایک دفعہ کہا تھا کہ "انور سدید کی حیثیت ایک جائزہ نگار کی ہے۔"

فضیل جعفری کی تنقید سے انور سدید کے جائزے کہیں زیادہ تعمیری ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان جائزوں میں انور سدید نے جس تنقیدی شعور کا اظہار کیا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کسی منفی ذہن کے نقاد کو نہیں ملا!

بلراج کومل

کثیر الجہت انور سدید

کچھ روز ہوئے میرے ایک دوست نے مجھے میری بیوی، بیٹے، بہو اور پوتے کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ہم لوگ آٹھ بجے کے آس ان کے ہاں پہنچے۔ وہاں پہنچنے پر پتہ چلا میرے دوست نے اچھی خاصی ہنگامہ خیز پارٹی کا انتظام کر رکھا تھا۔ کچھ مہمان پہنچ چکے تھے کچھ مہمانوں کے بہت جلد پہنچنے کی توقع تھی۔ کوئی ۹ بجے کے قریب خوشبوؤں، رنگوں اور روشنیوں کا ایک اجتماع کمرے میں موجزن ہو چکا تھا۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی گفتگو زیر و بم کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی اس میں تیز طرار جملے اور بلند آواز قہقہے بھی شامل ہو جاتے۔ جب یہ محفلِ رنگ و بُو نقطۂ عروج پر پہنچنے کے قریب تھی تو چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا ہاتھ میں کاغذ کا ایک تراشا لیے میری جانب بڑھا اور یہ تراشا میری جانب پھیلاتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

"میرا نام موہن ہے میرے گھر کے لوگ مجھے اتفاق سے ارسطو کہہ کر پکارتے ہیں۔ انکل مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میرے پاس جنرل نالج کے کچھ سوالات ہیں۔ سنا ہے آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں اس امید سے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے۔"

میں اس وقت ہوش و سرمستی کی اس منزل پر تھا جو فی الحال عرفان کی منزل ہرگز نہیں تھی اور نہ ہی امتحان سے گزرنے اور سُرخرو ہو کر نکلنے کی منزل تھی۔ لیکن بچّے کا اندازِ گفتگو اس قدر شائستہ اور مہذّب تھا کہ میں نے تراشا فوراً اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر مجتمع استفسارات کی تفصیل پر تیرتی ہوئی نظر ڈالی۔ اس دوران میں بچّے کی مسکراہٹ میں انتہائی شرارت آمیز دھار پیدا ہو چکی تھی اور وہ میرے اندر اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سوالنامے میں سوالات کی تفصیل کچھ اس قسم کی تھی۔

۱۔ نپولین کے سر پر کتنے بال تھے؟ صحیح تعداد کیا تھی؟

۲- مرغی کے انڈے کے خول کے نصف حصے کو اگر کشتی کی طرح استعمال کیا جائے تو کیا اس میں بیٹھ کر ایک چھوٹی چوہیا اوسط چوڑائی کے دریا کو پار کر سکتی ہے؟
۳- آلو بخارے میں آلو کی مقدار اور بخارے کے جغرافیے میں کیا تعلق ہے؟
۴- مائیکل جیکسن اور میڈونا کو اگر دودھ اور شکنجبین دونوں مشروب ایک ساتھ پیش کیے جائیں تو دونوں اپنی اپنی پسند کے مطابق کون سے مشروب کا انتخاب کریں گے؟

سوالنامہ نے مجھ پر یک لخت جادوئی اثر کیا۔ میں یکایک "عرفان" کی منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے لڑکے کے سامنے فوراً ایک تجویز رکھی۔ موہن عرف ارسطو۔ ایک سوالنامہ میرے پاس بھی ہے یوں کرو تم میرے سوالنامہ کا جواب دے دو اور میں تمھارے سوالنامے کا۔ لڑکا کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "میرا اور آپ کا کیا مقابلہ؟ بہر حال کوشش کروں گا لیکن پہلے آپ کو میرے سوالنامے کا جواب دینا ہوگا۔"

میں نے فوراً ردِ عمل کا اظہار کیا۔ "پہلے تمہیں جواب دینا ہوگا۔"

ہم دونوں ہجوم سے کچھ ہٹ کر ایک محفوظ گوشے میں آ گئے — "کہاں ہے آپ کا سوالنامہ؟" لڑکے نے سوال کیا۔

"میرے ذہن میں۔"

"عجیب سوالنامہ ہے۔ اچھا شروع کیجئے۔"

۱- ۲۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو میانی ضلع سرگودھا، پاکستان میں پیدا ہونے والے اس بچّے کا کیا نام ہے جو ۶۰ سال کی عمر پر محکمہ آب پاشی سے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے سبکدوش ہوا؟
۲- سول انجینئرنگ اور اُردو ادب میں کیا تعلق ہے؟
۳- اُردو ادب کی مختلف تحریکوں سے متعلق واحد کتاب کا مصنّف کون ہے؟
۴- وہ کون سا اُردو ادیب ہے جو تنقید تحقیق اور.......

میں ابھی اپنے سوالنامے کے چوتھے سوال تک ہی پہنچا تھا کہ لڑکا بول اٹھا۔

"بس۔ انکل بس۔"

اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اس سرگرم محفل کے کسی دوسرے حصے میں لے گیا اور مجھے ایک دراز قد، صحت مند اور واجبی طور پر خوش لباس شخص کے روبرو کھڑا کر دیا۔

"یہ رہا آپ کے سب سوالوں کا جواب۔"

میں انور سدید سے بڑی گرم جوشی سے لپٹ کر ملا۔ میں نے لڑکے سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ انور سدید کو کیسے جانتا تھا۔ اس کا دیا ہوا سوالنامہ میں نے انور سدید کی جیب میں ٹھونس دیا اور میں اور انور سدید لڑکے کو یہ یقین دلا کر محفل کے کسی دوسرے حصے میں جذب ہو گئے کہ لڑکے کے سوالنامے کا جواب انور سدید بذریعہ ڈاک اس کے پاس بھجوا دیں گے۔

میں تنہائی کے لمحات میں تخیل کی آنکھ سے اکثر مختلف قسم کے منظر دیکھتا ہوں۔ یہ فینٹسی سا منظر ان میں سے ایک ہے اور میرے ذہن میں اُبھرا بھی اسی انداز سے ہے۔

انور سدید سے میری پہلی 'جسمانی' ملاقات ۱۹۸۱ء میں لاہور میں ہوئی۔ ان سے ذہنی ملاقات اس سے قبل کئی برسوں سے ہو رہی تھی۔ میں ان کی شخصیت کی کچھ سوانحی تفصیلات اور کچھ ادبی تفصیلات سے سرسری طور پر شناسا تھا۔ لیکن "براہِ راست تصادم" کا یہ پہلا موقع تھا۔ کچھ تاثرات میرے ذہن میں واضح نقوش کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ مثلاً انور سدید محکمہ آب پاشی میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ انتہائی کثیر المطالعہ شخص ہیں۔ اطلاعات کی ترتیب و تدوین میں بے پناہ مہارت رکھتے ہیں اور ان کو موضوع اور مضمون کی نوعیت سے محفوظ رکھنے اور بوقتِ ضرورت لپک کر اٹھا لینے اور استعمال کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔

دوسری ملاقات ۱۹۸۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ اور تیسری حال ہی میں فروری ۱۹۸۹ء میں پھر دہلی میں ہوئی۔

انور سدید کا جسمانی انداز حملہ آور کا سا انداز ہے لیکن گفتگو کا انداز دوستانہ اور پُر استدلال ہے۔ ان کے پاس اطلاعات کا ایک پورا جہان ہے۔ ادب کے بارے میں، تاریخ کے بارے میں، کتابوں کے بارے میں اور شخصیات کے بارے میں۔ انور سدید کی خوبی یہ ہے کہ اطلاعات کی گھما گھمی نے ان کے ذہن میں غیر مطلوب کچرے کی صورت اختیار نہیں کی۔ ہر تفصیل ہر اطلاع اپنی مخصوص جگہ پر محفوظ ہے۔ وہ رشتہ بھی محفوظ ہے، جو ایک تفصیل کا دوسری تفصیل سے اور ایک اطلاع کا دوسری اطلاع سے ہوتا ہے۔

انور سدید کی جسمانی ساخت اور شکل و شباہت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی صحت کے توسط سے خدا کی دی ہوئی تمام مہذب اور محفوظ نعمتوں سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اختر شیرانی، مجاز، منٹو، میراجی کے قبیلے کے آدمی نہیں ہیں۔ انتہا پسندی کی کمزوری

ایک لہر بہرحال کبھی کبھی ان کے ذہن سے گزرتی ہے۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے اکثر و بیشتر متوازن رہتے ہیں۔ صرف کبھی کبھار کوئی سخت لفظ بولتے ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے وہ بڑی گہری وابستگیوں کے آدمی ہیں اور محفوظ جارحیت کی مدد سے دشمنوں کا قلع قمع کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں۔ میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ اپنے انسائیکلوپیڈیائی ذخیرۂ اطلاعات کی دہشت سے خود بھی کافی حد تک متاثر ہوگئے ہیں۔ اس لیے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے وقت یلغار کا طریق کار مہذب سطحوں پر رکھتے ہیں۔

انور سدید دشمن کی عزت تو کرتے ہیں لیکن اسے قابلِ معافی قرار دینے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت کے کچھ پہلو عناصر کی سطح پر ہیں اور کچھ پہلو عملی شہری کی سطح پر۔ اس لیے وہ ہر لمحہ ان دونوں پہلوؤں میں توازن کی سطح دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے بعض اوقات اس توازن میں جھکاؤ دشمن کی بیخ کنی کے انداز کا ہوتا ہے۔

انور سدید کی ادبی شخصیت کی کثیر الجہتی کے پیشِ نظر کئی بار میرے دل میں خدشہ پیدا ہوا ہے کہ کہیں وہ اپنی خداداد قوت کے پھیلاؤ میں اپنی مرکزی شناخت کو گم تو نہیں کر رہے۔ وہ تحقیق بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی لکھتے ہیں۔ (فکر و خیال، اختلافات، "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش"۔ "انشائیہ اُردو ادب میں"۔ "سفرنامہ اُردو ادب میں")۔۔۔ مخصوص مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ (غالب کا جہاں اور۔ اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ میر انیس کی قلمرو)۔ طنز و مزاح سے تخلیقی دلچسپی رکھتے ہیں۔ (غالب کے خطوط) ایک موضوعی کتابیں بھی مرتب کرتے ہیں۔ (وزیر آغا، ایک مطالعہ۔ مولانا صلاح الدین احمد، ایک مطالعہ)۔ ترتیب و تالیف کے تحت خطوط بھی مرتب کرتے ہیں۔ اور مختلف قسم کے ادبی انتخابات بھی۔ انور سدید کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اپنی شخصیت میں ایک نادر تخلیقی جہت بھی رکھتے ہیں۔ جس کے تحت انشائیے لکھتے ہیں۔ (ذکر اس پری وش کا، اور غزلیں بھی۔ معجزہ یہ ہے کہ ان کی منفرد اور مخصوص شناخت مسلسل اور متواتر روشن اور منور ہے اور اپنی تمام نجی، سماجی، خانگی، ملازمتی، ادبی ہنگامہ آرائیوں میں بھی زندہ و تابندہ ہے۔ انجینئر کے انداز میں تمام فاصلوں کی مسلسل پیمائش کرتے ہیں اور پھر ان کو عبور کر جاتے ہیں۔ اپنا دُکھ سہنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ کفایت شعار ہیں اس لیے مناسب سائز کے کاغذ پر خط لکھتے ہیں اور مناسب

سائز کے لفافے میں اسے بند کر کے مناسب رفتار کی ڈاک سے اسے بھجواتے ہیں۔ اسٹیشن، ہوائی اڈہ، بس اڈہ، میدانِ کارزار۔ ان سب کے مرکزی نقطے سے اپنے گھر کا ٹھیک فاصلہ اور ٹھیک راستہ جانتے ہیں اور راستے کے پورے منظر نامے کو۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو ذہن و دل میں رقم کئے ہوئے ہیں۔

میں کبھی کبھی بڑھتی ہوئی بھیڑ میں کھو جاتا ہوں۔ انور سدید تیز رفتار ہونے کے باوجود چاک و چوبند۔ آہستہ خرامی کو پسند کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ مجھے ٹھیک مقام اور ٹھیک موڑ پر مل جاتے ہیں اور ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ یہ سفر جاری ہے۔

انور سدید ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کے اپنے قول کے مطابق کچھ کام ملتوی کرنے لگے ہیں۔

ایک اور فینٹسی — اور میری فینٹسی کا جانا پہچانا نوجوان، ہیرو! شام کی محفل میں طلوع ہونے والا یہ نوجوان مجھے کل پھر اچانک مل گیا تھا۔ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے تمام سوالات کا جواب انور سدید کی طرف سے مل چکا تھا۔

انور سدید نے یہ کام بالکل ملتوی نہیں کیا۔

شیخ منظور الٰہی، انور سدید

رحمٰن مذنب

قلم دراز

ادیبوں کا تکیہ ——— پاک ٹی ہاؤس برسوں بعد آج بھی روایت کا پابند ہے۔ کتنے ہی ادیب آج بھی صبح بخیر کہنے آتے ہیں اور شب بخیر کہہ کر جاتے ہیں۔ پانی پینے والے بھی آتے ہیں اور وہ بھی آتے ہیں جو پانی پی پی کر کسی نہ کسی کو کوستے ہیں۔ سہ پہر کے وقت رونق بڑھ جاتی ہے۔ بعض کے لئے یہ گھر ہے، بعض کے لیے گھر کا نعم البدل جیسے جلسہ یا مشاعرہ سجانا ہو وہ یہیں آکر پکڑ دھکڑ کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ ملاقات کی عمدہ جگہ ہے۔

چند سال ادھر ایک دن ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ کچھ دور سے ایک بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں چہرہ شناس اور آواز شناس زیادہ ہوں۔ بسا اوقات چہرہ بھول جاتا ہوں۔ آواز یاد رہتی ہے۔ میں نے بیرے کو بلایا۔ ایک پرزہ نکالا۔ اس پر کچھ لکھا اور بیرے کے حوالے کیا تاکہ وہ بلند آواز والے صاحب کو دے آئے۔ بیرہ پرزہ دے آیا۔ پرزہ ملتے ہی وہ صاحب میرے پاس چلے آئے جن کی پہچان لانبا قد، اچھی صحت اور عینک ہے۔

یہ انور سدید تھے جو ایک مدت سے اپنی ذات کو دو لخت کیے ہوئے ہیں۔ بیک وقت انجینئر اور ادیب ہیں۔ ایک جگہ تعمیراتی کام کرتے ہیں، دوسری جگہ تعمیری۔ بہت جلد یک لخت ہونے کو ہیں۔ ٹی ہاؤس میں اپنے دفتری ہمکاروں کے ساتھ چائے پی رہے تھے اور قطعاً انور سدید نہیں لگ رہے تھے۔ عمر کا بیش قیمت حصہ تھلوں کو آباد

اور بے آباد زمینوں کو سیراب کرنے میں صرف کر چکے ہیں۔ دیانت داری کے طفیل تکلیفیں اٹھاتے اور انھیں "پارٹ آف دی گیم" سمجھتے رہے ہیں۔ مضبوط اعصاب رکھتے ہیں۔ کمزور اعصاب والے ہوتے تو تکلیفیں نہ اٹھاتے، افسرانِ زیریں و بالا کے ساتھ بیٹھ کر بالائی کھاتے۔ بہر حال ادب سے تعلقِ قلبی ہونے کے باعث رویّہ کچھ یوں رہا ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا لیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا لیا

انور سدید وہ تب ہوتے ہیں جب ہاتھ میں قلم یا کتاب ہو، ادبی جلسے میں یا ادیبوں کی محفل میں۔ ادب اور قلم ہی سے زندگی ہے۔ یہی جینے کا آسرا ہے۔

پہلی بار ڈاکٹر وزیر آغا کے بُلاوے پر سرگودھا گیا تو انور سدید سے بھی ملنا چاہا ان کے دفتر پہنچ گیا۔ جس سے پوچھتا، "انور سدید کس کمرے میں بیٹھتے ہیں؟" جواب ملتا، "اس نام کا کوئی شخص اس محکمے میں نہیں۔"

خاصی دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد، میری طلبِ صادق کو دیکھ ایک صاحب نے توجہ دی، بیٹھ جانے کو کہا۔ میں بیٹھا۔ ان کے پاس تین چار اور دانشور بھی بیٹھے تھے۔ میں بیٹھ گیا تو انہوں نے پوچھا "کیا کام کرتے ہیں وہ جنھیں آپ ڈھونڈ رہے ہیں؟" جواباً کہا۔ "قلم چلاتے ہیں، ہل نہیں چلاتے لیکن ہل چلانے والوں کے کام آتے ہیں آپ ہی کے محکمہ انہار میں انجینئر ہیں۔"

ان صاحب نے دماغ پر زور دیا۔ مصاحبین سے مشورہ کیا۔ ایک صاحب نے کہا۔ آپ میاں انوار الدین کا تو نہیں پوچھ رہے؟ میں نے صاف انکار کیا اور کہا۔ "مجھے میاں انوار الدین سے نہیں۔ انور سدید سے ملنا ہے۔" اور پھر ان کے سنجیدہ چہرے، بلند و بالا قد، صحت مند بدن، عینک کے علاوہ کچھ دوسری نشانیاں بتائیں۔ ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میاں انوار الدین ہی انور سدید ہیں۔ انہی کو شوق ہے پڑھنے وڑھنے کا۔ افسوس! ان کا تبادلہ ہو چکا ہے۔"

میں لوٹ آیا۔ تبادلہ ان کے معمولاتِ حیات میں تھا۔ اس واقعے سے مجھے

اپنی بھی قدر و منزلت معلوم ہو گئی جو برسوں ایک فلیٹ میں رہا اور جب کسی ملنے والے نے زیریں منزل والے سے پوچھا۔ "رحمان مذنب کہاں رہتے ہیں تو جواب ملتا اس محلّے میں اس نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔"

پھر جب اعجاز فاروقی نے چند دوستوں ــــ عارف عبدالمتین، صلاح الدین ندیم، صادق حسین، فرخندہ لودھی، صابر لودھی، انور سدید، غلام الثقلین نقوی اور راقم الحروف سے مل کر نئی ادبی تنظیم بنائی تو زبردست ادبی گہما گہمی کا آغاز ہوا۔ اپنے عام جلسوں کے مذاکرا اور سالانہ جلسوں کے اہتمام سے اسے بڑی شہرت ملی۔ اعجاز فاروقی اس "تنظیم کے بانی اور پہلے سیکرٹری بھی تھے۔ پھر جب "قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند" اور میں سیکرٹری بنا تو مجھے تمام دوستوں سے مسلسل رابطہ قائم کرنا پڑتا۔ انور سدید کے معاملے میں رابطہ کبھی کبھار اور تبادلہ بہت زیادہ ہوتا۔ یوں لگتا جیسے سب کے تبادلے انھی کے کھاتے میں ڈال دیے گئے ہیں۔

ہمارے یہاں دیانت دار کو دیانت داری کا تھوڑا بہت تو مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ مزہ چکھنے ہی میں فریقین کا بھلا ہے۔ وہ ایک کے خیر اور دوسرے کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔

بہرحال انور سدید خدا کا نام لیتے رہے اور بحمداللہ کسی نے تھانے میں جا کر رپٹ نہیں لکھوائی۔ اس طرح دیانت دار کو بھی پھل ملا ــــ صبر و شکر کی صورت میں اور بددیانت کو بھی پھل ملا۔ دونوں خوش رہے۔

انور سدید بے ضرر بھی ہیں اور بے نیاز بھی۔ کسی کے ثواب و عذاب بالخصوص حساب کتاب سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ جانتے ہیں کہ جو کرتا ہے سو بھرتا ہے۔ کوئی کرتا پھرے بھرتا پھرے۔ انھیں غم نہیں۔

اپنے رقیبوں اور اپنے ہم کاروں کی جسارت دیکھ کر وہ کبھی کبھی پریشان تو ہوئے لیکن حیران کبھی نہیں ہوئے۔ بس بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھتے رہے۔ اہلِ کرم ان کے پاس بھی آتے لیکن یہ انھیں دستِ کرم کے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہ دیتے۔

یہ ہے گھر چلانے اور اہلِ خانہ کو سلامت رکھنے کا چلن۔ ان کا قلمی چلن ذرا

مختلف ہے۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے ہیں۔ کوئی ٹوکے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ جلال میں آجاتے ہیں اور سچ کی خاطر "ٹوٹل وار" پر اُتر آتے ہیں۔ یہی ان کی کمزوری ہے۔ اسی میں ان کی طاقت کا راز پوشیدہ ہے۔

افسانہ نگار تھے، اب انشائیہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ تنقید کے معاملے میں گروہ بندی کے قائل نہیں۔ اس شخص کے اچھے کام کو بھی سراہتے ہیں جو گروہ بند ہو کر ان سے برسرِ پیکار ہو رہا ہو۔

زیادہ وقت تحقیق و تنقید کے کام میں گزارتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہی ان کے کام آئے گا۔۔۔۔ کچھ وقت پلٹنے، جھپٹنے، جھپٹ کر پلٹنے میں نکل جاتا ہے۔ اسے بھی "پارٹ آف دی گیم" سمجھتے ہیں۔ زبان کھولتے ہیں پول کھولنے کے لیے۔ یہ تبھی ہوتا ہے۔ جب پول، ڈھول پیٹنے اور انھیں پریشان کرنے لگے پھر وہ چل پڑتے ہیں۔ دُور تک جاتے ہیں لیکن راستہ نہیں بھولتے کیونکہ سامنے خطِ مستقیم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک جھوٹے کو گھر تک پہنچانا کارِ خیر ہے۔ اس سلسلے میں عدو کی جانب سے جو ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے اس سے مطمئن نہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ عدو ادب اور شائستگی کا دامن چھوڑ کر لڑ رہا ہے۔ بحث مباحثہ عمدہ ذہنی ورزش ہے بشرطیکہ علمی سطح پر ہو۔ کھیل ہو کھرا، فاؤل نہ ہو۔ اس سے کسی کی ذاتی تسکین ہوتی ہو تو ہو ادب کے قارئین کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ہم عصروں کو ایک ہی مشورہ دیتے ہیں۔۔۔۔ اپنا مقام پہچانو، اپنے مقام پر رہو اور کہنی مار کر آگے نہ بڑھو ورنہ انور سدید کو راستے میں پاؤ گے جو سخت جان ہے چٹان ہے۔ یہ تبھی ہوگا جب کوئی انھیں کہنی مارے گا۔ انھیں کہنی مارے بغیر کوئی تھان سے باہر نکل جائے اور خوامخواہ بڑا بننے کی سعی کرے تو ان کی بلا سے۔ وہ جانے اور اس کا کام۔ وہ ادب کے ٹھیکیدار نہیں کہ ہر آگے بڑھنے اور شیخی بگھارنے والے کا نوٹس لیں اور ٹنگڑی اڑائیں۔

سرگودھا سکول کے پکّے محافظ ہیں۔ بڑی عقیدت ہے انھیں اس سے۔۔۔۔۔۔۔
بعض لوگ فکر مند ہوتے ہیں، انھیں اپنی فکر پڑی ہے۔ کوئی سکول تب قیام پاتا اور کوئی ہ تب انجمن بنتا ہے جب ادب کے معاملے میں سچا اور پکّا ہو۔ اس کا مال کھرا ہو، لوگ

خود بخود اس کی عظمت کے قائل ہوں۔ دھونس اور دھاندلی سے بندہ وقتی طور پر بڑا بن جائے ـــــ اپنے پیچھے کوئی دستِ صبا، کوئی بالِ جبریل چھوڑ کر نہ جائے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ وہی وقت جو اسے آسمان پر چڑھاتا ہے، زمین پر پٹخ دیتا ہے۔ خرابات کی قدر ہے، خرافات کی نہیں۔

سرگودھا اسکول کے لیے وزیر آغا اور ان کے رفقا نے بڑا کام کیا ہے۔ انور سدید اسے تاریخی حیثیت دے رہے ہیں۔ ویسے اس سکول کا کام علی العموم لاہور میں ہوتا ہے کیونکہ دونوں ستون لاہور میں آگئے ہیں۔ ویسے لاہور ابتدا ہی سے سیاست اور علم و ادب کا بہت بڑا اکھاڑا ہے۔ بڑے بڑے دنگل ہوئے ہیں یہاں۔

وزیر آغا نے لاہور سے سٹارٹ لیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ ہوئے۔ یہیں ادبی دُنیا کی ادارت میں شامل ہوئے۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد لاہور ہی سے "اوراق" نکالا۔ یہیں انور سدید ان کے بازوئے شمشیر زن بنے۔ اور اب تو ما شاء اللہ سپاہ بھی کھڑی ہو گئی ہے۔ ایسے میں حریفوں کا قلعے کو سر کرنا محال ہے۔

انور سدید کے دو ہی کام ہیں۔ سرگودھا سکول کی نگہبانی اور تالیف و تصنیف۔ کسی سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے۔ یہ دونوں ہمہ وقتی کام ہیں۔ کچھ وقت بچتا ہے تو وہ دوستوں کی ملاقات میں لگ جاتا ہے۔ ان سے علمی اور ادبی باتیں ہو سکتی ہیں۔ جہاں غیر ادبی اور غیر علمی بات شروع ہو گی گاڑی تھم جائے گی۔

آج سے چالیس برس پہلے انہوں نے قلم اور کتاب سے یارانہ گانٹھا تھا اور اب یہ گلے کا ہار ہے۔ کتابوں نے گھیراؤ کر رکھا ہے۔ جب ان کے جواں سال بچے گاڑی لے کر سیر و تفریح کو نکلتے ہیں۔ یہ کاغذی پیراہن میں سمٹے سکڑے رہتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے یا کسی دوست سے باتیں کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ جغرافیائی اور ماحولیاتی (ECOLOGICALLY) صورتِ حال ترقی پسند ہے نہ صحت بخش لیکن وہ اس سے مطمئن ہیں۔

میاں انوار الدین ریٹائر ہونے کو ہیں۔ انور سدید خوش ہیں۔ لنگر لنگوٹ کس لیا ہے پوری قوت سے قلم دراز ہو گا۔ صاحبِ خانہ ہیں گھر کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے فکر ہیں۔ کیونکہ اولاد نیک اور برسرِ روزگار ہے۔ یہ فارغ البال ہیں۔ لیکن اتنا کافی نہیں ـــــ خانہ داری، ہول ٹائم جاب ہے لیکن ادیب اور شاعر کا اپنا بھی ہول ٹائم جاب ہے۔

میرے یہاں ایک تقریب پر ان کی بیگم میری بیوی سے ملیں۔ بہت خوش ہوئیں
دونوں خواتینِ خانہ دونوں کی ماشاءاللہ صحت ٹھیک تھی۔ ظاہر ہے اچھے ماحول میں
رہتی ہوں گی۔ باتیں چھڑیں، حجاب اٹھا، بے تکلفی کا مرحلہ آیا۔ پہلے تو اپنے اپنے
شوہر کی قلمی دھوم، شہرت، عظمت اور فتوحات کا ذکر ہوا۔ پھر اس کا ردِ عمل ہوا۔
اس سلسلے میں مشترکہ اعلامیہ تو جاری نہیں ہوا، لیکن جن خیالات کا اظہار ہوا وہ
انوکھے نہیں۔ ادیبوں کی بیویاں یہی کچھ کہتی ہیں اور سچ کہتی ہیں ——— اور
شرح یہ ہے:

ادیب، بیویوں سے زیادہ چند روپلی کے قلم پر جان دیتے ہیں
گھر بساتے ہیں اور پھر گھر کے اندر اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں۔

یہ سب کچھ درست ہے۔ ادیبوں کی بیویاں بڑی اچھی اور صبر و شکر کرنے والیاں
ہوتی ہیں۔ ان کے ایثار اور تعاون ہی سے ادیب کچھ کر سکنے کے قابل ہوتے
ہیں۔

انور جلال مرحوم (ملٹو ماموں کے مصنف) کی بیگم ایک کتاب لکھنے کے
دوران میں میکے چلی گئیں تو انہوں نے نہ صرف بیگم کے تعاون کا شکریہ ادا کیا بلکہ
کتاب بھی انہیں کے نام سے معنون کی۔

ادیب کے کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس میں اتنی بُری طرح پھنس
دھنس جاتا ہے کہ اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔

انور سدید اچھے سامع ہیں۔ بُردباری اور حوصلے سے بات سنتے ہیں۔
اختلافی مسئلہ آ جائے تو جھٹ چُپ کی مُہر توڑ دیتے ہیں۔ اور اپنی وضاحت پوری
کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

خاموشی عادت ہے۔ خاموشی سے کام کرتے ہیں۔ نئے نئے کام سوجھتے
ہیں۔ باقاعدگی سے لکھتے پڑھتے ہیں۔ خط عمدہ ہے لیکن کاتب کے پڑھنے کا
اپنا انداز ہے اور اسی لیے اپنے اندازے سے صحیح لکھتا ہے۔ اگرچہ غلط ہو جاتا
ہے۔ بعد ازاں انور سدید پروف ریڈنگ کرتے ہیں تو حسبِ عادت غلط کو بھی صحیح
پڑھ جاتے ہیں۔ اچھے پروف ریڈر کے لیے ضروری ہے کہ ادیب نہ ہو۔ غلط کو غلط

اور صحیح کو صحیح پڑھے۔

خط صاف ہے۔ دل بھی صاف ہے۔ منافقت نہیں کرتے۔ صاف سچّی بات کرتے ہیں۔ بُرے بھی بنتے ہیں لیکن پروا نہیں۔ ان کا طریق کار یہی ہے، بات کرو تو صاف اور سچّی ورنہ چُپ رہو۔ منافقت سے قطعاً دلچسپی نہیں رکھتے۔

لکھتے ہیں، بے تکان لکھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی رسالے یا ادبی انجمن سے مانگ آئی تو بلا تامل پوری کر دیتے ہیں۔ ایک دو مضمون تو ہر وقت تیار ہی رکھتے ہیں۔ انکار کرنے یا کسی کے دل دُکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

پڑھتے بھی ہیں، ہضم بھی کرتے ہیں۔ کتاب کو زیادہ اور مصنف کو کم دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ کہ حریف بھی کوئی اچھی چیز لکھے تو داد پا لیتا ہے۔

حالات و واقعات جیسے بھی ہوں، ان کے لیے ٹھیک ہے۔ شکوہ شکایت کی عادت نہیں ڈالی۔ قسمت تک سے شاکی نہیں۔ جو نالائقوں کو ان کی اوقات سے بڑھ کر دیتی ہے اور لائقوں کو اپنی کھال میں مست رکھتی ہے۔

بغض و حسد کی بیماری سے محفوظ ہیں۔ ان کی تندرستی کا یہ بہت بڑا سبب ہے۔ ساٹھ کے پیٹے میں آنے کو ہیں لیکن دیکھنے میں یوں لگتا ہے جیسے ادھیڑ عمر کے بھی نہ ہوں سفید بال غمازی تو کرتے ہیں لیکن عمر کا حساب لگانے میں یہ سند نہیں۔ کبھی کبھی بالوں کی رونمائی کمسنی میں بھی ہو جاتی ہے۔

سبزیاں کھاتے ہیں، سیر کرتے ہیں، تندرستی کا یہ بھی سبب ہے ـــــ محفل جاتے نہیں، جم جاتی ہے۔ باتیں ہوتی ہیں، کبھی‌کبھار سنز ہو جاتا ہے۔ تندرستی کے لیے یہ بھی ضروری ہے ـــــ جاہ پرست یا زر پرست نہیں۔ درویش صفت ہیں۔ قلم کو مال و زر کے حوالے نہیں کرتے۔ کیا عجب، جانتے ہوں کہ AMBITION بہت بڑی قاتلہ ہے۔ ہوس کا انت نہیں۔ لوگوں کو قبل از وقت ہلاک کر ڈالتی ہے۔

مستقل مزاج ہیں، ہٹ کے پکّے ہیں۔ قدم گاڑیں تو گاڑے رہتے ہیں۔ پیچھے ہٹتے نہیں۔ انھیں چھیڑو مت ورنہ پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کی کمزوری ہے اور اس کمزوری میں ان کی طاقت کا راز ہے جو کبھی لڑتے ہیں۔ دوست اور ہمکار بنا لے کا گُر جانتے ہیں۔ ساتھیوں کی چنداں کمی نہیں۔

ملازمت کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں، امید ہے، اب انھیں اور ساتھی بھی مل جائیں گے
سچ کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف لاتے ہیں۔ غلط بخشی اور غلط کاری سے سروکار نہیں رکھتے
لہٰذا جو لوگ ان کے مزاج آشنا اور ان جیسی طبیعت رکھتے ہیں، بلا تکلّف انھیں ملتے ہیں۔
غیر سنجیدہ کبھی نہیں ہوتے، ہنستے بھی کم ہیں۔ ان کے اندر چھپی ہوئی ہنسی کبھی کبھی باہر
آ جاتی ہے۔ دراصل ان کی محفل میں کوئی نظام وین نہیں جس کا مقام طبیبِ حاذق سے
کم نہیں ہوتا اور جو دوا کے بغیر دوستوں کو تندرست و توانا کر دیتا ہے۔ اس کے
دواخانے میں جوارشوں اور خمیروں کی بجائے لطیفوں کے انبار رہتے ہیں۔

جسمانی اور ذہنی —— دونوں اعتبار سے قدآور ہیں۔ جب تک کوئی بات نہ بنتی
ہو قلم نہیں اٹھاتے۔ ہمت والے بھی ہیں۔ قلمی جنگ بھی جاری رکھتے ہیں۔ مستقل
نوعیت کا کام بھی کرتے ہیں۔ پہلا کام خلافِ طبیعت ہے لیکن اپنی سلامتی کے لئے
اور اپنے عصر کو باخبر رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ دوسرا کام طبیعت کے مطابق ہے۔
ادیب کو یہی دوام بخشتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب جھوٹی اور جعلی شہرتیں دم توڑ
دیتی ہیں، کام ہی باقی رہتا ہے۔

اپنے عہدِ ملازمت میں خوب آوارگی کی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ اب صرف گھر
کا پانی پیتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ گھر بنا لیا ہے۔ ہیں تو انجینئر لیکن پیسے بنانا نہیں جانتے
پیسہ نہیں ملا، تجربہ ملا اور ان کے نزدیک تجربہ بہر نوع پیسے سے بہتر ہے۔ یہ اپنی
طرز کے آپ ہی ہیں۔ ہم نے ایسے ایسے انجینئر دیکھے ہیں جنہوں نے اپنے منصوبوں کی
کامیابی کے لیے ملک کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔ ٹھیکہ دینا اور پیسہ نہ لینا اچنبھے کی
بات ہے لیکن میاں انوار الدین نے یہی کچھ کیا ہے۔ ادب اور تنقید میں بھی یہی کچھ کر رہے
ہیں۔ یہ کام تعمیری ہے۔ تعمیراتی نہیں۔

کون فیصلہ کرے کہ میاں انوار الدین بڑا ہے یا انور سدید —— یا دونوں ہی بڑے
ہیں۔

فرخندہ لودھی

انور سدید۔ بھائی صاحب

(خاکہ)

یہ نکتہ شاید میں نے ہی اٹھایا تھا کہ گوشۂ انور سدید اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جائے گا جب تک بھائی صاحب کی نجی زندگی کی جھلکیاں سامنے نہ آئیں۔

بھائی صاحب کے بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتی۔ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دیوقامت مطبوعات اور کاٹ دار طرزِ تحریر کے باوجود بہت اچھے بھائی ہیں۔ شفیق والد، ذمہ دار شوہر اور بامروّت رشتہ دار ہیں۔ دوست تو خیر وہ جس کے ہوتے ہیں اس کے دشمنوں کے دشمن پکّے ہوتے ہیں اور ٹھٹھے ٹھناتے رہتے ہیں۔ قلمی میدان میں وہ قلم ٹھونک کے لڑتے ہیں۔ گھریلو زندگی میں نہایت لیپا اور صلح کُن —— نہ چوں نہ چراں ——

بھابی نے کہا:

"فلاں عزیز کے داماد کی نانی کے چچیرے کی پوتی کی منگنی میں جانا ہے۔"

"جی! جانا ہے۔"

"کل صبح ہی۔"

"جی! کل صبح ہی"

بھابھی ہماری نہ دبتو ہیں نہ دباؤ ہیں لیکن گھر کی راجدھانی میں وزیرِ اعظم کے

اختیارات رکھتی ہیں اور اپنے اختیارات کی حدود سے بے خبر نہیں۔ صدرِ خانہ بھائی صاحب ہی ہیں۔ پروٹوکول کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کو پہلی نظر میں دیکھنے والا خود کو ان کی قد آور اور بھاری بھرکم شخصیت تلے دبتا محسوس کرتا ہے۔ آواز اور لہجے کی کھرج، ماتحتوں کا خون خشک رکھنے کا قدرتی ہتھیار ، ان کے پاس ہے جسے وہ عام طور پر کم ہی استعمال کرتے ہیں لیکن جب کرتے ہیں تو ان کی معنک آنکھیں یہ نہیں دیکھتیں کہ "ڈوز" کتنا ٹھیک رہے گا۔ اپنے اس کھرجی لہجے کو شاید گھر میں بھی کبھی کبھار آزمانے ہوں تبھی ان کے چاروں صاحب زادے ماشاء اللہ ایک سے ایک لائق فائق، سعادت مند، محنتی اور اپنے "ٹریک" پر سختی سے کاربند ہیں۔ ٹریک پر رواں کامیابیوں، کامرانیوں کی منزلیں مارتے جا رہے ہیں۔ اس کا کریڈٹ اگرچہ بھائی صاحب کو نہیں ان کے مزاج کو اور ان کی مزاج شناس بیوی کو دیا جا سکتا ہے جیسے میں اوپر کی سطور میں وزیرِ اعظم کی مسند پر بٹھا چکی ہوں۔ جس ملک کا وزیرِ اعظم دانا اور صاحبِ تدبیر ہو اس کا ہر بندوبست خوب ہوتا ہے۔ بھائی صاحب کو بھابھی کی شکل میں "نصرت" ملی۔ یہ ان کی خوش بختی ہے۔ وہ جو کسی دانا نے کہا ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے اس کی بیوی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انور سدید کے ماتھے پر فتح و نصرت کے جتنے سہرے اب تک بندھے ہیں۔ ان کو ان کی بیگم پھول پھول، موتی موتی پروتی ہیں۔ "واہ واہ" بھائی صاحب سمیٹتے ہیں۔

انور سدید کی جملہ خوبیاں ایک طرف اور دنیا داری والی خوبی ایک طرف۔ یہ خوبی عام طور پر قلم کاروں میں نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو بے توازن سی۔ کبھی کبھی بعض قلم کاروں میں تو ایسا لگتا ہے جیسے:

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم، نے حیا ہے
آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دنیا داری کو ایک خاص بھاؤ پر رکھنا اور اک طرزِ اختیاری کے طور پر برتنا

ہمارے بھائی پر ختم ہے۔ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ فن کس سے سیکھا ——
لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ خدا کی دین ہے۔ وہ جس کو جیسا چاہے، جتنا چاہے
اور جب چاہے دے دے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر خاص مہربانی ہے — بھائی
صاحب موقع بموقع خدا پرستی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ زبانی کلامی نہیں عملی
طور پر —— مثلاً چند ماہ پہلے اللہ انہیں ایک پوتے سے نوازنے والا تھا —
پتلی جیسی نازک بہو تکلیف میں تھی۔ بھائی رات بھر سجدے میں گرے رہے، کبھی
تلاوت کرتے تھے اور کبھی گڑگڑاتے تھے۔ تلاوت کے دوران ہی منے کا پیارا
سا نام بھی کھوج لیا۔ اگلے دن جب مجھے نصرت بھابی نے بتایا کہ انور سدید
رات بھر اللہ میاں سے دعائیں مانگتے رہے تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کیوں کہ میں
نے انھیں بات بے بات اللہ اللہ کرتے کبھی نہیں دیکھا، بلکہ بعض اوقات ایسا
کہ جب میں بڑے گھمبیر معاملات میں آخری بات خدا پر چھوڑتی ہوں تو وہ میری
طرف بے یقینی سے دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے بھی نہیں بلکہ بات کو کانوں کے پیچھے
ڈال دیتے ہیں اور میں جھنجلا کر اس نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ افسر ہیں نا! مجھ منہ بولی
بہن کو بھی اپنا ماتحت سمجھتے ہیں۔ اور افسروں کی طرح خود کو خدائی کا جائز حق دار
سمجھتے ہیں۔

ادبی اور قلمی ذمہ داریوں سے سرشار انور سدید اپنے گھر کی چار دیواری
میں چلتے پھرتے، بیٹھتے اٹھتے نقاد، محقق، کالم نویس اور ڈاکٹر سب کچھ ایک
ساتھ نظر آتے ہیں۔ لنگر لنگوٹا کسے، ہاتھ میں قلم پکڑے، میز پر ہر طرف کتا
رسائل، اخبار پھیلائے پورے انہماک کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتے، سور
انھیں ہر روز دیکھتا ہے وہ سورج کو نکلتا نہیں دیکھتے۔ صبح تین بجے اٹھ کر
لکھنا شروع کرتے ہیں تو ناشتے کی پکار پر نگاہ اٹھاتے ہیں۔

"اوہ —— دفتر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

بھابی اس وقت تک ہر شے تیار کر چکی ہوتی ہیں۔ آج ناشتے میں کیا
ہے ان کے لیے کون سی چیز بہتر رہے گی۔ کھانے کی کتنی مقدار بھائی صاحب کو
ہے میز پر ملٹی وٹامنز رکھے رہنے چاہئیں۔ ان سب چیزوں کا حساب

بندوبست رکھنا بھابی کا کام ہے۔ بھابی ان فالتو باتوں میں بھائی صاحب کا دماغ خرچ ہونے سے بچائے رکھتی ہیں۔

لکھنے کے دوران میں بھائی صاحب ایک خاص کیفیت (TRANCE) میں ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے دانے پانی کا خیال بھابی ہی رکھتی ہیں۔ بھائی صاحب ذراسی آواز دینے کی زحمت ضرور اٹھاتے ہیں۔

"چائے"

کوئی چائے کی پیالی ان کی میز پر رکھ کر چلا جائے گا۔ دبے پاؤں، چُپ چاپ

"شربت فالسے کا"۔۔۔ حاضر ہوگیا۔ بغیر کسی آہٹ کے

"شکنجبین ۔۔۔ تھوڑا نمک"۔ میز پر موجود ہوجاتی ہے۔ نہ سانس نہ سرگوشی یہ فرشتہ صفت غیبی ہاتھ ہمیشہ بھائی صاحب کے کندھے پر ہوتا ہے۔ اور اقور سدیلہ شہنشاہ جہانگیر کی طرح "رَدِ قلم" سے کسی کو باندھتے ہیں، کسی کو چھوڑتے ہیں، کسی کو بخش دیتے ہیں اور کسی کو کبھی نہیں بخشتے۔

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھابھی نُصرت کو روبوٹ یا مافوق الفطرت سمجھ کر صرف حکم ہی صادر فرماتے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں ان کا۔ عام طور پہ شوہروں کو اتنا خیال رکھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ مثلاً گزشتہ سے پیوستہ گرمیوں میں اچانک خبر ملی۔ بھائی صاحب سیر پہ جارہے ہیں ۔۔۔ اگلے روز پتا چلا۔ خیر سے چلے بھی گئے اور ساتھ بھابھی گئی ہیں۔ تین چار روز بعد اطلاع ملی کہ واپس بھی آگئے۔

ملاقات ہوئی۔ استفسار کیا تو کھُلا سوات اور اس کا گردو نواح، سب گھوم گھام آئے ہیں۔ منگورا، سیدو شریف، بدین اور نہ جانے کون کون سے مقامات کی رنگین تصاویر تو ہم نے بھی دیکھیں۔ ان تصاویر میں بھائی اور بھابھی کسی نہ کسی طور موجود تھے۔ گئے ہی ہوں گے۔ ایک ثبوت ان کے اس سفر کے مختصر سفرنامے سے ملتا ہے۔ مگر بھابھی کے پُر مسرت ردِ عمل کی شہادت زیادہ مضبوط ہے۔ اور یہی بھائی صاحب کی گھریلو ذمہ داریوں کے احساس کا بیّن ثبوت بھی ہے۔

بھائی صاحب کو کھُل کر ہنسنے کی عادت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بلند وبالا قہقہہ سننے میں آتا ہے۔ سننے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ بات قہقہے جتنی اونچی تو نہ

تھی۔ لیکن اپنا اپنا زاویہ نظر ہے۔ بھائی صاحب کا ذہنِ رسا دُور کی کوڑی لاتا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر کئی صفحات لکھ سکتے ہیں۔ قہقہہ تو فوری ردِ عمل ہے۔ مسکراتے تو خیر وہ ہر وقت رہتے ہیں تاہم اس مسکراہٹ کو آنکھوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ شاید تبھی رعب داب قائم رہتا ہے مگر یہ رعب داب نہ معلوم اس وقت نشے کی طرح کہاں ہرن ہو جاتا ہے جب بھائی صاحب ڈاکٹر وزیر آغا کی معیّت میں ہوتے ہیں۔ شدید دباؤ کے تحت پھیلے ہوئے ہونٹ اور تنی ہوئی بھنویں ایک غرور آمیز ترنگ کی غمّازی کرتی ہیں۔ دیکھنے والے کو صاف پتا چل جاتا ہے کہ ان میں سے ایک مُرید ہے اور دوسرا مُرشد! عام حالات کے برعکس یہاں پیر کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہاں پیر مختصر اور مرید ماشاءاللہ!۔۔ تاہم عقیدتمندی والا جھکاؤ گواہی دیتا ہے کہ مرید انور سدید ہی ہیں۔ اس مرید کی آنکھوں میں محبت، مروّت، محویت اور معصومیت سبھی کچھ گڈمڈ ہوتا ہے۔ بس!
"میں ناہیں سب توُں" کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

آغا صاحب کو ان کی اس کیفیت کا اندازہ بھی نہیں ہوگا مگر دیکھنے والے تاڑتے رہتے ہیں۔ اس عشق کا نام ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ آیا ذہنی عشق ہے، فہمی عشق ہے یا وہبی عشق ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس دن ڈاکٹر وزیر آغا لاہور میں ہوں گے بھائی صاحب کہیں نہیں ہوں گے۔ آغا صاحب کے پاس ہوں گے۔ ان کے ہاں فون کرو۔ جواب ملے گا۔

"آج کل آغا صاحب آئے ہوئے ہیں جی۔ اُدھر ہی بات کریں"۔

اور جو کہیں ایسے موقعوں پر ان سے کوئی کام آ پڑے تو آپ کو منہ توڑ جواب ملے گا۔ اُن کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کی موجودگی سے بڑی کوئی مصروفیت یا ذمہ داری نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مرید اپنے پلڑے میں ضخیم کتب کا بوجھ رکھتے ہوئے بھی خود کو مُرشد کا ہم پلہ نہیں سمجھتا، یہی اصل مرید کی پہچان ہے۔ آغا صاحب اپنی نازک، دھان پان شخصیت اور مقابلتاً گنی چنی تصانیف کے باوجود انور سدید کو اپنی ارادت سے روک نہیں سکے۔

بھائی صاحب سب کے ساتھ تعلقات کو خوش اسلوبی سے نبھانے کا ملکہ

رکھتے ہیں۔ گم نام سے گم نام ادیب کے ساتھ وہ اپنی ملاقات کا حوالہ دیتے ہیں۔
یہ الگ بات کہ وہ اپنی کوتاہی اور بدقسمتی کے سبب ان کے قلم کی زد میں نہ آئے
ورنہ وہ کسی کو نہیں بھولتے۔ سب کے نام ایک ہی پیرے میں بھگتا لیتے ہیں۔
اس وقت ان کے اس منصفانہ رویّے سے مجھے کسی گاؤں کی وہ عورت یاد آتی
ہے جو کسی مَنّت کے پورا ہونے پر گھنگنیوں کی پرات لیے، چوراہے میں بیٹھی بچّوں
کی جھولی میں ایک ایک "لپ" گھنگنیاں ڈالتی جاتی ہے۔ ایک بے تشریح طمانیت
اس کے بُشرے پر کھیل رہی ہوتی ہے —— انور سدید بھی جب ادب کی کسی صنف
کا جائزہ 'لکھتے' ہیں تو ایسے ہی باطنی جوش و خروش اور تسلّی و تشفّی میں خراماں
خراماں پھرتے نظر آتے ہیں۔

بھائی صاحب کا خاکہ لکھنے کے لیے میں خود کو کئی برس سے آمادہ پا رہی
ہوں لیکن وہی طبیعت کی کسل مندی اور بدعہدی، لفظوں کی تنگی اور بے آہنگی
—— مجھ جیسے لوگ قلم کاروں کی دُنیا میں کبھی کبھی ٹاک ٹوئیاں مار لیتے ہیں۔ میدان
مارنے والے شہسوار بھائی انور سدید جیسے ہی لوگ ہیں۔ قلم جن کے زیر ہیں۔ اتنے
رواں کہ مہمیز کی بھی ضرورت نہیں پڑتی —— اصل میں یہی لوگ آج کے ادب کی آبرو
ہیں۔

وزیر آغا، ساقی فاروقی، انور سدید، راغب شکیب (سرگودھا)

رشید نثار

ڈاکٹر انور سدید۔ ادب کا آئینہ ساز

ڈاکٹر انور سدید ہمارے عصر کی بے چین رُوح ہے۔ اس نے جب سے قلم سنبھالا ہے "قولاً سدیدًا" کی عملی تفسیر بن کر اس نے سچائی کے ساتھ مطابقت، حُسن کے ساتھ مشابہت اور خیر کے ساتھ صلاحیّت پیدا کی ہے۔ زندگی کے اس سفر میں اس نے کھٹنائیاں زیادہ دیکھی ہیں اور سُکھ صرف اتنا پایا ہے کہ زندگی کی ہمہ اوست میں اُس نے جبر سے سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی سچ کے کربلا میں اپنی آرزوؤں کا بلیدان پیش کرنے سے وہ ہچکچایا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت صداقت ہی کو حاصل ہے۔ اس لیے اس کی تمام تر منطق اجزاء سے کُل کی حقیقت اور کُل کے تصوّر سے اجزا کی ماہیّت کی جستجو سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح وہ زندگی کے عملی نتائج اور مجرد تصوّرات کو آسانی سے حاصل کر لیتا ہے۔ اور جذبات کی انگیخت سے صرف استدلال کی حد تک رہوارِ قلم کو سفر آمادہ رکھتا ہے۔ ورنہ اس نے فنِ منطق، استدلال کے خلاف کبھی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔

ڈاکٹر انور سدید کی ذہنی سرگرمیاں بہت سی ہیں۔ مثلاً اقدار کے انتشار میں زندگی، کلچر اور مسرّت کی تلاش۔ مؤثر انداز میں حقائق کے اظہار کی ہمّت اور حقیقت کو فن کا روپ دینے کی مہارت —— اُس نے اس سفر میں اعتراضات کے بھاری بھرکم پتھر کھائے اور کسی حد تک گالیاں بھی مگر اس نے کسی فرد کو شخصی

عینک سے کبھی نہیں دیکھا بلکہ منطقی قوت سے اس نے منافقت کے زنگ آلود قفل کھولے ہیں۔ اور جس طرح طریقِ کار سے بعض لوگوں نے مراعات یافتگی کی خاطر زندگی کے جمود کو قبول کیا ہے اور تاریخ کے جبر کے سامنے ہتھیار پھینکے ہیں، ان کے خلاف نتائج و عواقب سے بے پرواہ ہو کر اس نے صداقت کا علم بلند کیا ہے جس کی بنا پر اسے ہمیشہ ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر انور سدید معاشرے کے سکرات میں بیدار آدمی ہے اور یہی بیداری اس کی زندگی، علم، فن اور تاریخ بھی ہے۔ اس نے منافقت کے مقابلے پر استدلال، جذبات کے سامنے صداقت اور ہٹ دھرمی کے آگے زندگی کی اعلیٰ قدروں کو پیش کیا ہے۔ میں ڈاکٹر انور سدید کی زندگی، فن اور علم سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ اس نے ادب میں تجزیہ، فن میں استدلال ادبی صحافت میں منطق اور شخصی جذبات اور مباحث میں فطری رویّہ اپنایا ہے اور فطری بھلمنساہٹ کو قائم رکھ کر ذہن کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے عہد میں حُسن کی اقدار، ادب کی رفتار اور زندگی کے مدار پر ـــــ سب سے الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے۔ بعض اوقات اس نے اپنی تحریروں میں تفتیش کا عمل زیادہ دکھایا ہے۔ لیکن وہ بنیادی طور پر تحقیق کا مردِ میدان ہے۔ اس نے فکری آنچ کو انگیخت کے طور پر قبول کیا ہے اور منطقی استدراک کے ذریعے ادبی صحافت میں جمالیاتی اقدار کو بھی برقرار رکھا ہے۔ جس سے اس کے وژن، دائرہ عمل اور براہِ راست اخذ و نتائج سے اس کے دیرینہ تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کی اتنی سخت محنت اور شبانہ روز کی مشقت کو دیکھ کر اس کے مخالفین پہلے تو گھبراہٹ سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر منہ پھلا کر عورتوں کی طرح اسے کوسنے لگتے ہیں۔ عورتوں کی طرح اسے کوسنا اور پھر اسے ردِّ عمل کے طور پر نیچا دکھانے کی کوشش کرنا مردانگی تو ہرگز نہیں، لیکن مجروح انا کے سفر کی کہانی ضرور بیان ہوتی رہتی ہے۔ جسے اس کے قاری پڑھ کر لطف لیتے ہیں۔ کیونکہ انور سدید کے ہاں ہزیمت کا لفظ لغت سے خارج ہے۔

انور سدید کثیر الاحباب شخص اور محدود حلقے کا ادیب ہے۔ لیکن اس کی ادبی تیز رفتاری کو دیکھ کر اس کے احباب اور اس کے ناقد سب کے سب یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسے بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے کہ وہ سوداؔ کی طرح غنچہ کو حاضر کر کے قلمدان لے کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر جھوٹ کو اس کے پاؤں دکھا کر ہی دم لیتا ہے۔ میرے نزدیک

اس کا یہ ردِ عمل حقیقی اور ابدی ہے۔ وہ ان لوگوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا جو سازشوں میں سانس لیتے ہیں اور شرفا کی پگڑیاں اچھال کر کیف و سرور حاصل کرتے ہیں۔ انور سدید ان کے کیف و سرور کو فنی تخلیقی سطح پر تول کر صداقت کی بازآفرینی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور ان کے منہ جھلا دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مخالفین کی صحافتی توپیں صف آرا ہو جاتی ہیں اور پھر اتنے دھماکے ہوتے ہیں کہ شرافت کا ادھڑی کیمپ چشم زدن میں ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ مگر انور سدید شرافت کے ادھڑی کیمپ کے ملبے سے اٹھتا، دلیل کو انگیخت بناتا، نوعیت اور مقاصد کی میزان سجا کر ثابت کر دیتا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور صحافت جب توپ بن جاتی ہے تو واقعی دلیل کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ انور سدید دلیل کو ڈھال بنا کر صحافتی توپوں کے خلاف شرافت کا دفاع کرتا ہے ان کے بے بنیاد ہیجان کو ہوا میں اڑا دیتا ہے اور عوام الناس کو ایسے لوگوں کی اصل صورت دکھا کر اس وقت تک اپنی پیٹی نہیں کھولتا جب تک کہ مخالف سمت کی توپیں چپ نہیں ہو جاتیں۔ چنانچہ انور سدید جذباتی ہیجان جوش و انگیخت اور سنسنی خیزی سے بخوبی آشنا ہے۔ مگر وہ تحقیق و تجزیے کو بروئے کار لا کر مدلل طور پر اپنا دفاع خود کرتا ہے جبکہ مخالف سمت سے ہجویات کے پلندے گالیوں کے پتھر اور دشنام کے تھپیڑے برسائے جاتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کا جواب انور سدید کا مخصوص ردِ عمل ادب میں سچ کی تعبیروں کی گنجائش ہوتا ہے اور یہ دائرۂ عمل شرافت سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا انور سدید کے مخالفین بھی اب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس نے صداقت کی بازآفرینی میں تخلیق ہی کو مقصود رکھا ہے کہ اس نے غیر تخلیقی سطح کو کبھی قبول نہیں کیا۔

ایک زمانہ تھا کہ انور سدید ہمہ تن ردِ عمل تھا۔ مگر ڈاکٹر وزیر آغا کا بھلا ہو کہ انہوں نے دشنام اور صداقت کے فرق کے پیشِ نظر اسے ایک ایسے مقام سے آشنا کیا جس کا تمام حسن ایک اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ انور سدید نے تنقید کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک سچے ادیب کی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کیں۔ اب انور سدید تنقید کا معیار ادب کی اپج اور تاریخ کے حسن کا نام ہے۔

انور سدید اتحاد و یگانگت کی علامت بھی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو اپنے جلو میں لے کر چلتا ہے اور فن کی اہمیت کے پیشِ نظر اس نے "نظریۂ ضرورت" سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور جب کہیں اس نے محسوس کیا کہ اس کے احباب بھی سچ سے نظریں چرانے لگے ہیں تو اس نے اپنے احباب کو اس کیفیت سے آگاہ کیا کہ سچ کی بازآفرینی ادب کا مطمحِ نظر ہے لہٰذا ادب کی خاطر اپنی ذات کو انفرادی واردا توں کا نکتۂ نظر نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس کے تمام احباب جذباتی ردِ عمل سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے جس تحریک کا آغاز کیا ہے کہ تخلیقی سطح پر زندہ ہو کر دوسروں کو زندہ رہنے کا موقع دو۔ انور سدید کے تمام احباب پروپیگنڈے سے احتراز کرتے ہیں اور کسی کی جذباتی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اس طرح انور سدید اپنے احباب کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ملا کر آگے بڑھتا ہے اور اس کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

انور سدید ہنگامی اقدار سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی نفسیاتی اعتبار سے وہ جذبات کا آدمی ہے وہ تو ادبِ عالیہ اور اس کے بلند مقاصد کا علم بردار ہے۔ اس نے فن کی عظمت کی خاطر ایک مشن اپنا رکھا ہے جس نے اس کے ادب میں ایک مستقل نظامِ فکر کا روپ دھار لیا ہے۔ اس نے انسانی جبلی تقاضوں اور اس کے ماتحت زندہ رہنے والوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اس نے ایسے انسانوں کو اس گروہ میں شامل کیا ہے کہ جو مخصوص تقاضوں کی خاطر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً ایسے انسان سچے افراد کے خلاف بے تحاشا پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ بلا ضرورت باتیں بناتے اور انہیں بتنگڑ کی صورت میں پیش کر کے لذتوں کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ انور سدید ان کے خلاف بند باندھتا ہے۔ ان کے ذہنی اور عملی مواقع کو مخدوش بنا دیتا ہے۔ ان کے سازشی انتظامات کو طشت از بام کر دیتا ہے۔ ان کی چوریوں اور سینہ زوریوں کا سُراغ لگا کر ان کے جبلی تقاضوں کے راز فاش کرتا ہے۔ اس طرح وہ دفاعی جنگ لڑتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ذوقِ جمال اور انسانی فطرت کی طرف دوستوں کو دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ادب، تنقید، تاریخ، تحریر، کالم نگاری، شاعری اور سُراغ رسانی کے ذریعے وہ سچ کی ترغیب پیدا کرتا ہے تاکہ ادیب جبلی تقاضوں کے خول سے باہر آ کر سچ کا سامنا

کرے اور کسی تلازمے اور سچے اختلاف کے ذریعے ایک ادبی مقام پیدا کرے
لیکن بعض نظریات اور مقاصد پسند انسانوں کو جبلّی خول ہی پسند آتا رہا ہے۔ اس
لیے ان کی زندگی کا دھارا مجرد نظریات کی طرف بہتا رہتا ہے۔ اس لیے وہ موجود بالذات
اور نظریات کے خول میں اسیر رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اب بھی معا
میں موجود ہیں، مگر ان کی توپیں خاموش ہیں۔ شاید ان کا گولہ بارود جو دساور سے آ
تھا، آنا بند ہو گیا ہے۔ چنانچہ انور سدید کا قلم بھی اپنی ادائیں نہیں دکھا رہا۔

انور سدید نے سچے اور کھرے ادب کے ذریعے ایک بنیادی فرق یہ پیدا کیا ہے
کہ ادب پروپیگنڈہ نہیں ادبی حقیقت ہے۔ فن اقدار کو پیدا کرتا ہے اور ایک سچا
فن کار ہی اقدار کی پہچان رکھتا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے انور سدید کے ادب و فن کا احا
کریں تو پتہ چلے گا کہ اس کا ادب حقیقی ہے جذباتی نہیں اس کے تمام تر مباحث منطقی
ہیں اسلوبی نہیں۔ وہ حقیقت کا احساس پیدا کر کے اس کے ادراک کے لیے جمالیاتی
تاثیر کے ساتھ ادیب کے کردار پر بھی بحث کرتا ہے۔ کیونکہ ادیب کا کردار ادب
کے احاطے میں OUT SIDER کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ
INSIGHT MAN کا وجود رکھتا ہے لہٰذا غیر جذباتی لیکن استدلالی
طریق کار سے انور سدید زندگی کے استعاروں اور ادراک زندگی سے فیض حاصل
کرتا ہے۔ اور یہ مستقل فن اس کے ادب کا معیار اور تنقید کا اختیار
ہے۔ اس طرح وہ بحیثیت نقاد زندگی کے کم و بیش کو ناپنے میں مہارت تامہ رکھتا
ہے۔

انور سدید احساسِ فرض کا منفرد تخلیقی فن کار ہے۔ اس نے نثر کے علاوہ
نظم بھی لکھی ہے۔ حمد، سلام، نعت کے ذریعے اس نے عقیدت کا طلسم پیدا
کیا ہے۔ تخلیقی رو کو روا رکھ کر اس نے مثالِ حسّی کا ماحول پیدا کیا ہے۔ اس
انشائیوں نے ذہنی جذباتی اور شخصی تاثر منتقل کیا ہے۔ اس نے ابہام، مجہولیت
اور بے لگام جذبے کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اس نے جب اپنی تنقیدی کتاب "اختلا
کا اشتہار شائع کیا کہ اس کتاب کے ذریعے تعصبات کی دھند چھٹ جاتے گی
تو اس نے ادب کے سچے قاری کو تنقید کی حقیقت اور جمالیاتی اقدار سے آشنا

تھا اور تعصب، غیر صحت مند ماحول اور بیمار واقفیت کے چنگل سے آزادی دلانے کا
بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس نے وصف نگاری کو ایک مقام بخشا ہے بلکہ غالب کے خطوط کی
پیروی میں اس نے تفنن کی جس کیفیت کو ملحوظ رکھا ہے اس نے ادب کے قاری کو
خوش گوار حیرت سے دوچار کیا ہے۔ اور غالب کے مخصوص اسلوب میں اس کی کاپی
کر کے ایک عجیب سی "انتخابیت" سے کام لیا ہے جو انتہائی مشکل اور کٹھن مرحلہ ادب
ہے، مگر انور سدید اپنی لگن اور غالب شناسی کی بنا پر اس سفر کو بھی کامیابی سے طے
کر گیا۔ میں نے جب انور سدید کی زندگی کا اس پہلو سے مطالعہ کیا تو مجھے وہ رمزیت کا
رمزی اور جمالیاتی بُعد کا ادیب دکھائی دیا۔ اس نے غالب کے خطوط میں جو حُسن پیدا
کیا ہے اس نے اس کی اپنی زندگی کے اخفا کو اُجاگر کیا ہے کہ انور سدید نے یہ خطوط
لکھ کر اپنی شخصیت کے اظہار کی داخلی خواہش کو تخلیقی محرک بنایا ہے۔ اور ادب
میں ایک خارجی صورت کو پیدا کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے خطوط نوعیت
کے اعتبار سے موجودہ عہد میں انور سدید کی داخلی تحریک کا ایک عنصر تھا۔ اس طرح
غالب ہمارے عہد میں نئے واقعات کے ساتھ لاشعوری تاثرات اور پُراسراریت
کے ساتھ دوبارہ دُنیا میں وارد ہوا ہے۔ چنانچہ غالب کے خطوط میں ایک خارجی
تحریک اور ادبی تعلق کی نشان دہی تلازمۂ خیال کی صورت میں موجود ہے۔ بلکہ
غالب کی روایت کو من وعن نبھا کر انور سدید نے داخلی واردات کا بھیس بدل
کر اپنا نیا رُوپ دکھایا ہے۔

ادب میں بہت عرصہ پہلے ادبی مفاہمتوں اور منافقتوں کا دریا رواں تھا۔
... ت سے ادیب تمغے حاصل کرنے کے لیے یا براہِ راست حکومتِ وقت کے ساتھ
... جھا کر کے تلازمۂ خیال کو جھٹلا رہے تھے بلکہ نوجوان ادیبوں کی تقلید میں نئے
... مضامین چُرا کر انھیں پالش کر کے اپنے ادب کو "نیا مال" کہہ کر بازار میں لا
رہے تھے اور نئے ادیبوں کے تجربات کا اعتراف بھی نہیں کر رہے تھے۔ یہ صورت
... بڑی تشویشناک تھی۔ بالخصوص جدید ذہنوں کے لیے یہ اذیت ناک کیفیت تھی
... ا انھوں نے "لنڈا بازار" کے ادیبوں کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ خصوصی طور
... ن ادیبوں کے خلاف ان کے جذبات بڑے جارحانہ تھے جو نئے نئے ادیبوں کے

کلام میں سے اچھے خیالات چُرا کر اخبارات اور رسالوں میں شائع کرا دیتے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں بالکل منفرد انداز سے انور سدید نے یک و تنہا ادب کے محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں براہِ راست ادب کا اظہار کرنے والے اور صحافتی قسم کے ادیب بھی صحت مند داخلیت کی طرف آمادۂ سفر ہوئے اور صحافت سے ہٹ کر انھوں نے معنویت اور تاثیر کے امکانات کا جائزہ لیا۔ لہٰذا اس تحریک کو پیدا کرنے میں انور سدید کی بے پناہ کوششیں، لگن اور محنت کارفرما رہی ہے۔

انور سدید نے ایک عہد میں "اختصار" کی تحریک کا آغاز کیا تھا اور کسی حد تک اسے کامیابی بھی حاصل ہوگئی تھی۔ مگر ماہنامہ "اُردو زبان" کی بے وقت بندش نے اس تحریک کو ابتدا ہی میں کمزور کر دیا۔ ورنہ "اختصار" کی تحریک ادبی تخلیقات کی ارتقائی منازل کا احاطہ کرنے کے لیے بے حد اہم تھی۔ چنانچہ انور سدید کے ادب میں خصوصی طور پر انشائیے، تعارف ناموں، تبصروں اور مقالات میں اس تحریک کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔

بنیادی طور پر انور سدید افسانے کا مردِ میدان ہے۔ مگر افسانہ اس کے لیے وسیع کینوس نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تنقید، تحقیق اور تحریک کا آغاز کیا اور یہ کہنا درست ہو گا کہ اس نے مراعات کی غیر موجودگی میں کسی نشے کے بغیر، کسی روپے کی طاقت اور گروہ کی قوّت سے بے نیاز ہو کر ان تھک محنت کی ہے جس سے اہلِ یونان کے فلاسفہ اور برصغیر میں سرسید کے عہد کے ادبا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اتنا کثیر الجہات آدمی، اتنا محنتی اور شریف انسان ہمارے عہد میں پیدا نہیں ہوا۔ (انور سدید ایسی تعریفوں سے ناراض ہو جاتے ہیں اور خفگی کا اظہار کرتے ہیں) مگر مَیں تو ان کے علم، دانش، تصوّر اور تجزیے سے واقف ہوں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ جو شخص صبح منہ اندھیرے اٹھ کر اپنی ذات کی تنہائی میں بیٹھ کر ادب لکھے، صبح دفتر جا کر وہاں بھی دیانت داری سے فرائض سرانجام دے۔ رشوت، شراب، عورت اور گروہ بندی سے نفرت کرے وہ شخص تنِ تنہا ادب کے محاذ پر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دے تو ایسے شخص کو ایک ادبی

مجاہد نہ کہا جائے تو اور کہا جائے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انور سدید کو تنقید کا مردِ آہن کہا ہے۔ میں انور سدید کو مردِ تحقیق اور ادب کا مردِ شریف کہتا ہوں۔ اس کی علمی تحریریں، فرائض منصبی سے دلچسپی، دفتری اوقات کی پابندی، اپنے پیشے پر عبور، ادب اور سائنس سے یکساں لگاؤ۔ انگریزی کالم نویسی میں مہارت، تردید یا تائید سے بے نیازی —— اور پھر ادب کی تمام تحریکات پر نئی تحقیق کا آغاز یہ ایسے مسائل ہیں کہ جنہیں وہ یکہ و تنہا طور پر طے کرتا ہے اور کوئی خارجی سہارا بھی حاصل نہیں کرتا بلکہ توازن قائم رکھ کر شخصی ردِ عمل میں ایک بے باکی پیدا کر کے سرشادی حاصل کرتا ہے تو ہمارے عہد میں اتنا کام کرنے والے یا تو شراب پیتے ہیں۔ ادب میں جوا کھیلتے ہیں۔ مراعات کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں یا خوبصورت عورتوں کے جمگھٹ میں رہ کر نمائشِ دنداں کرتے ہیں۔ انور سدید ایسا نہیں کرتا۔ وہ خرابیوں کی بے اعتدالیوں، خندۂ دنداں نما والے ادیبوں کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیا کرتا ہے۔ اس کی زیرِ لب مسکراہٹ بھی بڑی شدت رکھتی ہے اور اندرونی طور پر ایک استہزا کی صورت حاصل کر لیتی ہے آپ اسے "نفسی انبساط" بھی کہہ سکتے ہیں مگر انور سدید اس طرح شرافت کی بنیاد کو مستحکم کرتا ہے۔

ہمارا موجودہ عہد ادبی صحافت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے صحافتی ادیب بعض مسائل کی حمایت میں اور کچھ اختلاف کی صورت میں صرف پروپیگنڈے کے سہارے زندہ رہتے ہیں مگر اس طرح اپنی شخصیت کا اظہار تو ہوتا ہے کسی تخلیق کا باعث نہیں بنتا لہٰذا انور سدید نے ایک انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ادب کی پیچ در پیچ کیفیات کا احاطہ کیا ہے۔ اس نے اپنی انفرادیت کے لیے ایک تو بے پناہ محنت کی ہے۔ انوکھی تحقیق کے ذریعے بعض اچھوتے خیالات اور افکار کو فروغ بخشا ہے اور تمام تر ادبی محنت کو ذاتی یا شخصی نہیں بننے دیا۔ اس طرح ادب کی ہمہ گیر تحریکات کو وہ منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اب ادب کا عام قاری بھی اس کی تحقیق کی سچائی اور ژرف بینی سے آشنا ہے۔

ادب میں ذاتی یا شخصی معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن انور سدید نے کسی معاملے کو شخصی اور ذاتی نہیں بنایا۔ کیونکہ وہ براہِ راست سماج سے نہیں ٹکراتا، بلکہ ادبی شعور کے فروغ کے لیے وہ ان باتوں کی ٹوہ لگاتا ہے جن سے ادب کو نقصان پہنچ رہا ہے اور سچائی

کے کربلا میں یزیدیت کو فروغ مل رہا ہے ۔ یہ ایک ایسا مشن ہے کہ جس سے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور انسانی عظمت کا احساس بڑھتا ہے ۔ چنانچہ انور سدید اپنے مشن کی گرفت سے بھی آزاد نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ وہ "سمجھوتے باز" ادیب نہیں ہے بلکہ اقدار اور وقار پر تعاون پیش کرنے والا با شعور انسان ہے ۔ میں نے اپنی ذاتی سطح پر جب بھی انور سدید کے ادب کو پرکھا ہے اس میں بے خوفی ، بے باکی کا عنصر نمایاں دکھائی دیا ہے ۔ اس نے کسی کی توہین کبھی نہیں کی اور نہ ہی سچ کہنے میں رسوائی کا خوف اس کا دامن گیر ہوا ہے بلکہ جب ایک بزرگ شاعر کو بہت بڑے میلے میں لوگوں نے سننے سے انکار کر دیا تو انور سدید ہی نے سب سے پہلے اس طرزِ عمل کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا تھا چنانچہ انور سدید حق کے لیے جرات کرتا ہے اس میں ایک گونہ عظمت کا پہلو ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی انداز سے حق کی پہچان کا جواز نکال لیتا ہے ۔

انور سدید ادبی صحافت میں بہت عرصے سے اپنے جوہر دکھا رہا ہے ۔ ادبی صحافت کچھ دوسرے ادبا کا میدان بھی ہے مگر انور سدید اور ایسے افراد میں فرق "صحافتی کنایاتی" انداز کا ہے ۔ کیونکہ انور سدید غیر شخصی سطح پر تاثر کو قائم کرتا ہے جبکہ دوسرے ذاتی تاثر کے ذریعے جرأت اور صحت کے اطلاق کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے لیکن انور سدید ایک تخصیص کے ساتھ جتنی جرأت کے ساتھ اظہار کرتا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور اطمینان بھی کہ نوعیت کے اعتبار سے منطقی استدلال انور سدید کا میدانِ عمل بن جاتا ہے جس میں وضاحت ، صحت اور موضوع کی تخصیص اتنی منور ہوتی ہے کہ ایک عام انسانی ذہن بھی اس کے استدلال سے روشن ہو جاتا ہے ۔

چنانچہ آپ انور سدید اور صحافتی ادیبوں کے مابین آسانی سے خطِ امتیاز کھینچ سکتے ہیں ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے قیمتی مقالے انور سدید تنقید کے مردِ آہن میں میزانِ عدل کی بات کی ہے ۔ میں ان کی تائید میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ انور سدید مستحکم اقدار کے لیے جنگ لڑ رہا ہے جبکہ بہت سے دوسرے ہنگامی لوگ ادب کے محاذ پر زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ چنانچہ انور سدید اجتماعی ادب اور ازلی اقدار کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کر رہا ہے اور اس طرح وہ ادب کا ایک ایسا رہ نورد

ثابت ہوتا ہے جس کا ہر قدم استقرائی عمل کا پیش خیمہ بنتا ہے اور وہ تمام جزئیات سے کل کا تصور کشید کر کے تجزیے کا سہانا روپ دکھانے پر قادر ہو جاتا ہے۔

موضوعات کے انتخابات اور تخیل و استدراک میں انور سدید کی چابکدستی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ وہ ادب کی سطروں میں چھپے ہوئے معانی کی دریافت میں بڑی سرعت دکھاتا ہے۔ وہ حافظے کی بنیاد پر یادداشتوں کا طویل سلسلہ رکھتا ہے اور وسعت تخیل کی بے پناہ قوت سے بہرہ یاب ہو کر تخلیق، فن اور نتائج کے اصول وضع کرتا ہے اور کلی مماثلتوں میں زندہ رہ کر فکر و دانش کا استنباط کرتا ہے۔

دبستانِ سرگودھا ایک ایسا نام ہے جسے سن کر کچھ لوگ ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔ مگر اس دبستان کا فردِ واحد انور سدید ہے جس نے سرگودھا کو دبستان بنانے میں اپنی ندرتِ تخیل کو صرف کیا ہے۔ چنانچہ دبستانِ سرگودھا نے برِ صغیر پاک ہند میں اظہار کی خارجی صورتوں مثلاً زبان و بیان، تشبیہہ و استعارہ، مجاز و کنایہ میں بنیادی تبدیلیاں کی ہیں اور ایک ایسا اسلوب تراشا ہے جو دبستانِ سرگودھا ہی کے ساتھ وابستگی رکھتا ہے۔ چنانچہ انشا میں تہذیبی ذہنی کیفیت کی شمولیت تخیل کی ماہیت میں انقلابی علامت کا رواج اور جدید نفسیات کی روشنی میں لاشعوری عمل، نئے تصورات کا سلسلۂ وجود اور حتمی مماثلتوں کے تحت جو تلازمۂ ادب امتیازی کیفیت بن کر آیا ہے۔ اس کے فروغ و احیا اور استحکام میں انور سدید کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا —— یہاں یہ امر بھی قابلِ غور رہنا چاہیے کہ دبستانِ سرگودھا نے ہی جدید نفسیات کو ادبی سطح پر متعارف کرایا ہے بلکہ یونگ، ایڈلر، گورجیف سنگر، جانسن جیسے نابغہ نفسیات کو شعوری طور پر قبول کیا ہے۔ چنانچہ فرائڈ کے بعد نظم، غزل، افسانے اور انشائیے میں تخیل کی غیر اختیاری صورت اور منطقی ذریعے سے پہنچنے کا تخلیقی عمل جدید نفسیات ہی کی دین ہے اور اسے دبستانِ سرگودھا نے شعوری اور اختیاری ذہنی عمل کے تناظر میں دیکھا ہے اور یہیں سے ایک فرق قائم کیا ہے کہ دلیل تہذیبی تمثیلی عمل ہے اور کٹ حجتی غیر مہذبانہ تخریبی عنصر ہے۔ چنانچہ دبستانِ سرگودھا نے برِ صغیر پاک و ہند میں جو ردِ عمل پیدا کیا ہے یا نتائج حاصل کیے ہیں۔ ان میں نزاکت، باریک بینی کا فرق موجود ہے۔ جہاں

دبستانِ سرگودھا نے دلیل کا پھول پیش کیا ہے وہاں جواب کے طور پر اسے کانٹے اور پتھر ملے ہیں۔ مگر سرگودھا دبستان نے معانی کی گمریزیائی کے عہد میں کیکر پر انگور نہیں چڑھایا اور نہ ہی کسی خوشے کو زخمی ہونے دیا ہے۔ چنانچہ نوعیت کے اعتبار سے دبستانِ سرگودھا نے انور سدید کو جس منظر پر پیش کیا ہے۔ وہ ادب کا محاذ ہے نہ کہ صحافت کا لہٰذا نزاکت ادب کا ورثہ ہے۔ اور باریک بینی کسی شریف ادیب کا حُسنِ عمل! لیکن صحافت میں حُسن، خیر اور روشنی کو چندھیا دینے والے لوگ اب بھی موجود ہیں اور ایسے لوگ ہی انور سدید کے تخلیقی کارناموں کو بہت سی عینکیں پہن کر دیکھتے رہتے ہیں۔

آج انور سدید ادبی محاذ پر بذاتِ خود ایک تحریک ہے۔ اس نے دبستانِ سرگودھا کی داخلی اور روحانی تحریک کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ اس کی ادبی اور فنی تخلیق کا منبع دبستانِ سرگودھا ہے۔ بظاہر یہ بات غیر اہم دکھائی دیتی ہے۔ لیکن موضوع اور اسلوب کی ترویج میں انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا کی شرافت فنی تخلیق اور ادبی آدرش سے متاثر ہوا ہے جس سے اس نے اپنی ادبی جزئیات کا احاطہ کیا اور روز و شب کی محنت سے ایک زندگی وضع کی ہے۔ اس کے اس نے دبستانِ سرگودھا کے ساتھ اپنی فطرت کو منسلک رکھا ہے اور اس دبستان کا دفاع جس انداز سے کیا ہے اسے محسوس کر کے ایک سکون نصیب ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

انور سدید آج کل انگریزی کالم نویسی کے ذریعے ادبی اعمال کو پیش کر رہا ہے۔ اگرچہ انگریزی اس کے لیے اجنبی زبان نہیں ہے۔ لیکن اُردو زبان کی آسودگی سے وابستہ رہ کر اس نے طویل عرصے کے بعد انگریزی کی طرف جست لگائی ہے اور اتنے خوبصورت تاثراتی کالم سپردِ قلم کئے ہیں کہ اس کی انگریزی دانی کی "قدرت" اور "عبور" دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اب میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ اس نے انگریزی کی طرف رجوع کس لیے کیا ہے۔ فطری اعتبار سے وہ اُردو ہی کا نقاد ہے اور ادیب۔ بلکہ اُردو کے ساتھ اس کی محبت بے پایاں اور لازوال ہے۔ مگر شاید —— "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لیے" کے

مصداق۔ اس نے انگریزی کو نفسیاتی طور پر قبول کیا ہے۔ اور یہاں بھی اس نے اپنے فطری جوہر دکھا کر انگریزی تحریر کے ارتقا سے شعوری لگاؤ کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ میں نے اس کے بہت سے کالم مطالعہ کیے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس کی تحریر میں آسودگی، جذبے کی صداقت اور تحریر کا ملکہ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی خوبی نہ صرف مابہ الامتیاز ہے بلکہ اُردو کے وسیلے سے انگریزی کو ایک اور کامیاب نقاد مل گیا ہے۔

انور سدید نے اب تک پروفیسر مجنوں گورکھپوری، سبطِ حسن، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، ڈاکٹر وزیر آغا اور غلام الثقلین نقوی پر خوبصورت مقالے تحریر کئے ہیں۔ اس نے بعض الجھی ہوئی ذہنی صورتوں کو متشکل کیا ہے اور وضاحت کے ساتھ اپنا نکتۂ نظر پیش کیا ہے جس کے نتیجے میں کراچی اور لاہور کے انگریزی قارئین نے اس کی کوششوں کو بے حد سراہا ہے اور اس طرح اس نے اُردو سے الگ انگریزی قارئین کا ایک حلقہ بنا لیا ہے۔ میں بھی اس کا ایک عام قاری ہوں اور جب بھی میں نے اس کی انگریزی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے تو مجھے محسوس ہوا ہے کہ انور سدید نے اپنی ایک اور جہت کا انکشاف کیا ہے اور فن کی ایک نئی دنیا تلاش کر لی ہے جس کی تعبیر حکایتِ خونچکاں بھی ہے اور جنوں کا والہانہ پن بھی۔ میں نے دبستانِ سرگودھا کی بات چھیڑی تھی۔ میں دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں کہ دبستانِ سرگودھا کے بارے میں مراعات یافتہ لوگوں نے بہت سے مغالطے پھیلاتے ہیں۔ ان تمام مغالطوں کو انور سدید کے جنوں نے ہاتھ کٹوانے تک اکتفا نہ کرتے ہوئے گردن کٹوانے تک سفر کیا ہے۔ چنانچہ جنوں کی حکایات کے ساتھ ایک تعمیری مقصد اور انتقالِ معانی کا فریضہ بھی اس نے انجام دیا ہے۔ یاد رہے دبستانِ سرگودھا انتقالِ معانی ہی کا علم بردار ہے نہ کہ انتقال اقتدار کا۔ کیونکہ اقتدار کے ساتھ لوگ ساجھا کر کے معانی کے انتقال کو روک دیتے ہیں۔ لہٰذا انور سدید دبستانِ سرگودھا کا وہ مردِ مجاہد ہے جو ہر لمحہ متحرک، زندہ اور سلسلہ وار آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس نے اپنے تحرک کی بنا پر بے شمار تلازمۂ ادب پیدا کئے ہیں۔ نئے معانی اور نئی

تحریکات کے لیے اس نے فن کارانہ اسلوب اور تنقیدانہ شان پیدا کی
ہے اور ظاہر ہے تنقیدی شان اور فن کارانہ اسلوب کے امتزاج سے
ادب بذاتِ خود آئینہ بن جاتا ہے اور آئینہ سازی انور سدید کی دیر
اور امتزاجی سوچ کا غیر اختیاری حُسن ہے۔

اظہر جاوید

مجنّوں کا وکیل انور سدید!

کئی سال پہلے میں نے انور سدید کی تقریب میں ایک مضمون پڑھا تھا اس وقت
بھی میں نے اعتراف کیا تھا کہ وہ بہت مرتّب شخص ہیں اور میں بے حد بے ترتیب
——— جس شخص نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا ہو وہ اپنی چیزوں کو کیا سمیٹے گا۔ نثر تو رہی
لگ۔ بُرے بھلے جو شعر کہے ہیں انھیں بھی اکٹھا نہیں کر سکا۔ وہ مضمون بھی کہیں کھو گیا
یرا خیال تھا انور سدید نے اسے سنبھال لیا ہو گا کہ وہ اچھی بُری ہر چیز احتیاط سے رکھ
لیتے ہیں لیکن معلوم ہوا، یہ معاملہ بھی ان کے انتخاب کا ہے کہ جسے چاہیں وہ رکھ لیں،
سے چاہیں چھوڑ دیں۔ اس مضمون کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ میری خوش فہمی ہے میں
نے وہ مضمون اچھا لکھ لیا تھا۔ باقی خواتین و حضرات کی آرا کے بارے میں تو میں مان لیتا ہوں وہ
تکلف آمیز ہوں گی، مگر اس محفل میں ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے ثقہ لوگ بھی تھے جو تنقید اور تحقیق
یں رُو رعایت نہیں کرتے۔ انھوں نے بھی اس مضمون کو سراہا تھا۔ لکھنے کو تو میرے ایسا
ندہ سارا دن کچھ نہ کچھ الم غلم لکھتا ہی رہتا ہے۔ اپنے تئیں بہت تیر چلا لیتا ہوں۔ مگر
یسی تحریریں جنھیں میں خود بھول جاتا ہوں۔ انور سدید کے لیے لکھا ہوا وہ مضمون اچھا
ھا گیا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے جاوید میاں داد کا چھکّا کبھی کبھار ہی لگتا ہے۔

اس مضمون میں میں نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ کسی صاحبِ ولایت کے
رے میں چرچا ہوا کہ وہ ایک ہی وقت میں اپنے ڈیرے پر بھی ہوتا ہے اور اسی وقت
اں چاہے حاضر ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے صوفی کو اس پر شک گزرا ——— وہ
نی ولایت سے تصدیق کے لیے اس مقام پر پہنچا۔ معلوم ہوا صاحبِ ولایت
دار کرے میں وضو کر رہے ہیں۔ دوسری ولایت سے آنے والا صوفی حجرے میں

داخل ہوا تو عجیب منظر دیکھا، ہر کونے میں وہ صاحبِ ولایت موجود۔ اِدھر وہ، اُدھر وہ۔
ہر کونے سے آواز آرہی تھی۔ آئیے تشریف لائیے۔ آنے والے صوفی نے حیرت اور عقیدت
سے سر جھکالیا۔

اس حکایت کو میں نے انور سدید پر منطبق کیا تھا کہ ان کا عالم بھی اسی صاحبِ ولایت
جیسا ہے۔ آپ تشکیک کی گرہ ڈالیں نہ ڈالیں، جدھر آنکھ اٹھائیں، ہر ادبی کونے میں
انور سدید نظر آئیں گے۔ کسی کے حق میں لکھنا ہو تو انور سدید آگے آگے۔ کسی کی مخالفت
کا جواب دینا ہو تو وہ پیش پیش —— اپنی من مرضی سے تو خیر وہ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ کیا
کیا لکھتے ہیں۔ اس کی خبر شاید انہیں خود بھی نہ ہو۔ اُردو، پنجابی، انگریزی تین زبانوں
میں تو وہ رواں دواں ہیں۔ پچھلے دنوں حج پر گئے تھے۔ کیا پتہ عربی زبان میں درک پالیا ہو۔
اور اب جو کوئی عربی جریدہ آتے تو اس میں انور سدید کا نام بھی نظر آتے۔ مجھے چونکہ الحمدللہ
اور سبحان اللہ سے زیادہ عربی نہیں آتی۔ نہ جانے اس میں کیا لکھا ہو آج تک عبدالعزیز خالد
کی لکھی ہوئی چیزوں کی کہاں سمجھ آئی ہے۔

بندہ لکھے تو انور سدید پر کیا لکھے —— ان کی شاعری۔ اُردو اور پنجابی کا جائزہ لیا
جائے۔ شخصیت نگاری کا حوالہ دے —— خاکہ نگاری۔ انشائیہ نگاری۔ کالم نگاری،
تنقید، تحقیق اور پھر وزیر آغا کے دفاع میں لکھی ہوئی تحریریں یا اپنے موقف کی بابت میں
کی ہوئی گل فشانیاں —— جسے کور ذوق کسی کے خلاف سمجھ کر مختلف الزامات بھی دھرتے ہیں۔
—— ان کے کس پہلو پہ بات ہو، ہر فن میں طاق، ہر صنف میں باکمال —— پھر سب سے
بڑی بات یہ کہ ٹوٹ کر محبت کرنے والے، جس سے محبت کرتے ہیں، اس کے فرشتوں کو بھی
معلوم نہیں ہوتا کہ انور سدید نے کہاں کہاں ان کے لیے کیا کچھ لکھا ہے۔ اچانک ایک
دن ڈاک سے کوئی تراشہ یا فوٹو سٹیٹ کاپی ملے گا اور آپ کو معلوم ہوگا کہ مدراس، کلکتہ
یا ٹانگانیکا کے کسی اخبار میں انور سدید نے آپ کی مدح سرائی کی۔ یقین مانئے۔ اس وقت
جہاں ان سے عقیدت کا جذبہ فراواں ہوتا ہے وہیں خود پر شرم بھی آتی ہے کہ ہم تو اس شخص
کے لیے کبھی کچھ بھی نہ کرسکے۔

انور سدید بھی عجیب شخص ہے —— صلے اور محبت کے جواب سے بے نیاز اپنی دُھن
اور لگن میں مست اپنے دھیان میں لگا رہتا ہے۔ کسی نے پیار سے دستک دے دی

چہرے پر شادابیاں کِھل اٹھیں گی۔ بے نیازی دکھائی تو آنکھوں میں ملال نہیں چمکے گا۔ یہ ہم ایسے دُنیاداروں کا شیوہ ہے کہ ہاتھ میں ترازو تھامے محبّت کے ناپ تول میں لگے رہتے ہیں۔ کسی نے محبّت کا جواب محبّت میں نہ دیا تو تُو تھی سُجا لیتے ہیں۔ اور انا کا نام لے کر محبوب سے گلہ گزاری شروع کر دیتے ہیں۔ کاش۔ ایثار، وارفتگی اور ایسی بے غرضی کا سلیقہ انور سدید مجھے بھی سکھا دیں۔ وزیر آغا کا معاملہ ہی لیں ــــ کئی معاملات کا تو مجھے بھی علم ہے اور کئی مواقع کا میں عینی شاہد ہوں۔ کہیں چیچو کی ملیاں یا جام شورو کے کسی ہفتہ وار پرچے یا کسی سکول میگزین میں کسی منچلے نے وزیر آغا کی کسی تحریر پر انگلی رکھ دی۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے انور سدید اس کا جواب بھیج چکے ہوں گے۔ اور جب جواب چھپے گا تو پھر کہیں جا کر وزیر آغا کو خبر ہو گی کہ ایسی واردات در واردات ہو چکی ہے۔ یا ایسا بھی ہو گا کہ انور سدید نے کچھ لکھا اور اپنی رَو میں دو چار گنے چُنے ناموں کا تذکرہ ذرا زیادہ بے تکلفی کر دیا تو وزیر آغا نے ٹوک دیا ــــ بلکہ اس تذکرے کو ختم نہیں تو کم ضرور کروا دیا۔

وزیر آغا سے انور سدید کو محبّت ہی نہیں عقیدت ہے یا شاید ایسی محبّت ہے جس میں عقیدت کا عنصر زیادہ ہے یا ایسی عقیدت ہے جس میں محبّت کا رنگ چوکھا ہے یہ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا ــــ یوں سمجھ لیں یہ فیصلہ کرنا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں کیونکہ میں محبّت اور عقیدت دونوں جذبوں سے آگاہ ہوں۔ یہ الگ الگ بھی ہوں تو انسان کو مرکز سے ہلنے نہیں دیتے۔ اکٹھے ہو جائیں تو معمول بنا دیتے ہیں۔ مَیں تصوّف کا قائل ہوں۔ ابھی گھائل نہیں ہوا کہ کسی سے باقاعدہ بیعت نہیں ہوا۔ مگر اس دنیا کے اسرار و رموز کو محبّت کی حد تک جانتا ہوں جیسے مُرید اور مُرشد کا تعلق ہوتا ہے اور جس طرح اس تعلق میں مُرشد مُرید کو یہ نہیں کہتا کہ تم میرے ہاتھ چومو یا جوتوں میں بیٹھے رہو ــــ مُرید تو دمضطرب ہوتا ہے۔ خود اس شوق میں لگا رہتا ہے کہ کہاں اور کیسے کیسے اپنے مُرشد کی بڑائی بیان کرے۔ شاید اس میں لاشعوری طور پر مُرشد سے اپنے تعلق کی سند پیش کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہو۔ مَیں اپنے معاملے میں جانتا ہوں۔ میں جس سے محبّت کرتا ہوں اُسے مُرشد سے بھی بڑھ کر خدا کی طرح پُوجتا ہوں۔ پھر ہند تا سندھ ــــ جہاں جہاں مجھے موقعہ ملتا ہے بلکہ موقعہ نہ بھی ملے تو موقع نکال کر میں اس ہستی کا چرچا کرتا ہوں۔ اس کی تعریف

کے پھول کھلاتا رہتا ہوں۔ اس کی توصیف کے رنگ بھرتا رہتا ہوں۔ یہ میری محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ نیازمندی کا اعلان ہوتا ہے۔

محاوروں میں اور کتابوں میں انتھک کا لفظ بہت پڑھا تھا۔ میں بھی شاید کچھ لوگوں کے سامنے اپنے بارے میں یہی دعوےٰ باندھوں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ شام پڑتے ہی ایک جیسا کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔۔ انور سدید کی شام کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی ہے۔ اب تو خیر وہ ریٹائرڈ ہو گئے ہیں۔ ملازمت (اور وہ بھی محکمہ انہار کی) میں تھے تو وہاں کے ذمہ دار اور ماہر افسروں میں شمار ہوتے تھے۔ پوری ڈیوٹی دیتے تھے۔ دوروں پر جاتے تھے مگر جہاں بھی گئے اور جیسے ہی وقت ملا۔ اپنا جزدان کھول لیا اور چل میرے خامے بسم اللہ!۔۔ آج کل ان کی روٹین کیا ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ نہیں مگر پچھلے دنوں جب وہ حج پر گئے تو ان کی پرفکشن (اکملیت) کا مجھے ایک بار پھر اعتراف کرنا پڑا۔۔۔ سعادتِ حج سے فیض یاب ہونے کے بعد وہاں اپنے اعزاز میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں شرکت بھی کی اور ان تمام دنوں میں وہاں سے دوستوں کو خطوط بھی لکھے۔ اللہ کیا جگرا ہے، کیا توانائی ہے۔ چشمِ بد دور۔

بات بڑی سہی مگر مثال دینے کے لیے اتنی جسارت کرنی ہی پڑتی ہے جس طرح شمس تبریزؒ اور مولانا رومؒ اور نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کے نام ہر تذکرے میں اکھٹے پروئے ملتے ہیں اسی طرح آج کے عہد کی ہر ادبی تاریخ میں انور سدید اور وزیر آغا کے نام یک جان بنے نظر آتے ہیں۔ وزیر آغا اُردو ادب کا بڑا، بہت بڑا نام ہیں۔ وہ پارس ہیں کوئی ان کے ساتھ لگ جائے تو سونا بن جاتا ہے۔ مگر اپنے پرائے سب اعتراف کرتے ہیں کہ انور سدید ان سے مَس بھی نہ کرتے تو پھر بھی کندن ہوتے بلکہ مخالفین کبھی کبھی سیاسی چال چلتے ہیں اور انور سدید کو پٹی پٹائی تجویز پیش کرتے ہیں کہ آپ نے خواہ مخواہ وزیر آغا کے ساتھ نتھی ہو کر اپنی حیثیت کم کی ہے۔ آپ تو نامِ خدا ان سے بھی بڑے ادیب اور نقاد ہو سکتے تھے۔ انور سدید بڑے متحمل، مرنجان مرنج اور ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں۔ مگر ایسے موقع پر وہ بھی بھڑک اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں۔۔۔ "صاحب میں جو کچھ بھی ہوں۔ وزیر آغا کے طفیل ہوں۔ وہ نہ ہوتے تو انور سدید بھی نہ ہوتا۔ میں تو ان کے بغیر اپنے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ہمارے آپ کے لیے وزیر آغا پیغمبر نہیں ہیں، مرشد بھی نہیں۔ اس لیے مجھ ایسے دوستوں کو وزیر آغا سے کبھی کبھی کوئی شکایت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت انور سدید ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اچھے وکیل بھی ہوں گے۔ دو ایک ماہ ہوئے میں نے کچھ شکایات کے سلسلے میں انور سدید کے حضور عرض گزارش کی ان کا بیٹا بھی ساتھ تھا۔ میں نے کہا۔ میں بیٹے کی موجودگی میں اس لیے بھی یہ گفتگو کر رہا ہوں تاکہ نئی نسل کو اندازہ ہو کہ ان کے بڑے کس قسم کے معاملات سے دوچار ہیں۔ اس روز پہلی بار میں نے انور سدید کو برہم ہوتے اور جواباً ناراضی کا اظہار کرتے دیکھا۔ کہنے لگے۔ ہمیں بھی آپ سے بہت سی شکایتیں ہیں۔

میں سنبھلا اور اب مدافعت کی سوچنے لگا۔ پھر کہا: "جناب قدرتی بات ہے۔ میں بھی انسان ہوں اور بے احتیاط بندہ ہوں۔ یقیناً مجھ سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، جہاں دوستی رکھنی ہو نبھانی ہو وہاں یا تو شکایت کر لینی چاہیے یا پھر ایسے ضبط کریں کہ حرفِ شکایت کبھی زبان نہ آئے۔ ذکر کرکے بات کو چھپا لینا مناسب نہیں ہوتا۔ آپ فرمائیں بلکہ میری غلطیاں گنوائیں۔"

اس روز انور سدید ایسے موڈ میں اٹھے کہ میں سمجھا اب تعلقات میں ایک دراڑ سی آگئی ہے۔ مگر چند ہی دن بعد ان کا نہ صرف محبت سے بھرپور خط آیا، بلکہ الٹا میری تعریف میں چند جملے بھی لکھے ہوئے تھے کہ اس دن کی محفل کے نتیجے میں انھوں نے (انور سدید) مجھ سے فلاں فلاں اچھی بات لی ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ شخص محبت کی کس مٹی کا بنا ہوا ہے اور اس کا ظرف کتنا روشن ہے۔ اللہ جانتا ہے میں نے بہت سے انسانیت کے دعوے داروں کی قلعی کھلتی دیکھی ہے اور لطف یہ ہے ــــ اس خط کے چند ہی دن بعد کسی بھارتی رسالے میں تخلیق پر ایک خوبصورت تبصرہ چھپا ہوا تھا ــــ اس کا پتہ بھی مجھے ان کی طرف سے بھیجے گئے ایک تراشے سے چلا۔

انور سدید لکھنے پڑھنے میں اپنی جناتی خوبیوں کے باوجود انسان ہیں ــــ ایسا جسے پیار بھی آتا ہے اور غصہ بھی ــــ جو دوستی بھی کرتا ہے اور دشمنی بھی اور جو ہنستا بھی ہے اور انسانی دکھوں پر آنسو بھی بہاتا ہے۔ میں تو

دُنیا داری کی دلدل میں بُری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ لکھنے پڑھنے سے ذرا سی فرصت ملے تو نا زبردار یوں میں مشغول ہو جاتا ہوں، مجھے تو اپنی زندگی میں یہ کام کرنے کی توفیق نہیں ہو گی، مگر میری خواہش ہے کہ انھیں بھی کوئی انور سدید ملے جو انھیں وزیر آغا بنا دے۔ ان کی بلبیوں چھپی ہوئی خوبیوں کو بھی نمایاں کرے اور جو کام اب تک انھوں نے کیا ہے، جو کارنامے سرانجام دیے ہیں، جو معرکے مارے ہیں انھیں سلیقے سے مرتب کرے اور قرینے سے کوئی کتاب ان کے بارے میں چھاپے۔ مجھے یقین ہے ایسا ہو گا۔ اور شاید جلدی ہو۔

انور سدید، اے۔ بی اشرف، عنبر چغتائی، سجاد نقوی، رضیہ فصیح احمد

محمد منشا یاد

بحرِ ادب کا شناور

ڈاکٹر انور سدید پیشے کے لحاظ سے انجنیئر ہیں اور مجھے ان کا ہم پیشہ ہونے پر فخر ہے لیکن وہ دونوں میدانوں یعنی ادب اور انجنیئرنگ میں مجھ سے زیادہ لائق ہیں اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔

ادب میں ادیب انجنیئروں کی بیش بہا خدمات ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا، محمد خالد اختر اور محمد کاظم کے تخلیقی اور ادبی کارناموں سے آپ سب واقف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا ہادی رسوا سے لے کر اب تک انجنیئر ادیبوں کا زیادہ تر رجحان نثری اصناف کی طرف رہا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے ایک مخالف فلمی شاعر نے ایک مرتبہ انھیں مستری کہہ کر ان کی تضحیک کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اس سے مجھے بھی تکلیف پہنچی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مستری کو میں اپنے سے کم تر یا الگ مخلوق سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ کہنے والے کا مقصد مستری کو حقیر قرار دینا تھا حالانکہ دی گئی دھنوں پر ضرورت کی ریتی سے رگڑ رگڑ کر لفظوں کو فٹ کرنا اور بولوں کو مختلف سچوایشنز کے خراد پر چڑھانا بذاتِ خود مستری گیری ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے علمی اور ادبی کاموں سے تو میں آپ سب کی طرح آگاہ ہوں اور ان کا اس وجہ سے بہت احترام کرتا ہوں لیکن مجھے ان سے ذاتی ملاقاتوں اور تعلقات کا کم موقع ملا ہے۔ صرف ایک بار میں نے ان کو ادبی سیاست کے حوالے سے مختصر سا خط لکھا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ انھوں نے ہر ادیب کی علیحدہ فائل کھول رکھی ہے چنانچہ

جب رشید امجد کے ایما پر اعجاز راہی اور احمد داؤد نے افسانوں کا ایک انتخاب چھاپا اور کتاب کو وقیع بنانے کے لیے کتاب میں شامل میری کہانی کو آخری وقت پر نکال دیا گیا تو کتاب چھپنے کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں مشتاق قمر اور منشایاد کی کہانیوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اس ہمدردانہ تبصرے سے شہ پا کر میں نے انہیں خط لکھا اور اس واقعہ یا واردات کے پس منظر اور یہاں کی ادبی سیاست سے آگاہ کیا۔ اُمید ہے وہ خط ان کے پاس ریکارڈ میں اب بھی محفوظ ہوگا اور بوقتِ ضرورت کام آئے گا۔

ڈاکٹر انور سدید سے میں اس وقت سے متعارف ہوں جب وہ افسانے لکھتے تھے ان کا افسانہ "کچی مٹی کا بند" اب بھی مجھے یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ان کے بار بار تقاضا کرنے پر میں نے اُردو زبان کے لیے افسانہ "تیرھواں کھمبا" بھیجا تھا جو انہیں اتنا پسند آیا تھا کہ انہوں نے اسے اُردو زبان میں شائع کرنے کی بجائے اوراق کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے ان کی ڈاکٹر وزیر آغا سے محبت اور اوراق سے دلچسپی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ (خدا کا شکر ہے کہ انور سدید نے افسانے لکھنا چھوڑ دیے ورنہ انہیں بھی بہت سے دوستوں سے محروم ہونا پڑتا اور پھر افسانوں کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کون لکھتا اور افسانوی ادبی جائزوں میں ناانصافیوں کا تدارک کیسے ہوتا۔)

ڈاکٹر انور سدید کے علمی اور ادبی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ "فکر و خیال"، "اختلافات"، "اقبال کے کلاسیکی نقوش"، "اُردو ادب کی تحریکیں"، "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" اور بہت سی دیگر تصنیفات اور تالیفات ان کے تنقیدی شعور اور علمی مرتبے کو پہچاننے میں مدد دیتی ہیں۔ "ذکر ایک پری وش کا" ان کے انشائیوں کا خوبصورت مجموعہ ہے اور "غالب کے نئے خطوط" پڑھ کر ہماری ملاقات ایک خوش مزاج تخلیق کار سے ہوتی ہے۔ ان کے مضامین، مقالات، تنقیدیں، تبصرے، مراسلے، دیباچے اور ادبی جائزے پڑھ کر ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور خیال آتا ہے کہ وہ بڑے علمی کاموں کے لیے پیدا ہونے والے لوگوں میں سے ہیں۔ ان بڑے کاموں میں ایک اہم کام ان کی کتاب "ڈاکٹر وزیر آغا۔ ایک مطالعہ" ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے فن اور فکر کو سمجھنے میں

معاونت کرتی اور ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار جدید دور کے اہم ترین شاعروں، نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے اور اس قسم کی کتاب کی جو ان کے فن اور فکر کی تشریح و توضیح کرے نہایت شدت سے ضرورت تھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے یہ ضرورت پوری کر دی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اتنا لکھ پڑھ چکنے کے بعد ایک بلند پایہ نقاد اور ادیب ہونے کے باوصف اور خود ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ڈاکٹر وزیر آغا سے دوستی، تعلق اور محبت نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں علی الاعلان کہتے ہیں:

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ میری ادبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس نے ڈالا ہے تو میں بلا توقف ایک نام لوں گا۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا"

وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے معتقد ہی نہیں ان کے احسان مند بھی ہیں کہ انہوں نے ادبی زندگی میں ان کی معاونت اور رہنمائی کی۔ شاید سرگودھا کی مٹی میں ایسی کوئی خاصیت ہو گی یا پھر اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید زیادہ تر بڑے شہروں سے دُور رہے ہیں۔ ورنہ بڑے شہروں کی منافقتوں، بے وفائیوں اور احسان فراموشیوں کی عظیم روایات کا کچھ نہ کچھ اثر ان پر بھی ضرور پڑتا۔

دی گولڈن بو یعنی شاخِ زریں کے مصنف جیمس جارج فریزر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا تھا اور بعض دن اس سے بھی زیادہ۔ وہ اتوار یا کسی اور تہوار کو چھٹی نہیں مناتا تھا لیکن اس کے کام کی مقدار اور محنت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے جیسے وہ دن میں بارہ گھنٹے کی بجائے چوبیس گھنٹے کام کرتا رہا ہو۔

ڈاکٹر انور سدید نے بھی جتنا کچھ اب تک لکھا ہے۔ افسانہ، شاعری، انشائیہ، طنز و مزاح، مضامین و مقالات، ادبی جائزے، دیباچے، تبصرے، دبستانِ سرگودھا کے خلاف چھپنے والی تحریروں کے جوابات، کالم خطوط وغیرہ اگر ان سب کا حساب کیا جائے تو یقیناً ایسا ہی تاثر ملے گا کہ وہ دن میں چوبیس بلکہ پچیس گھنٹے کام کرتے رہے ہوں گے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کچھ لکھنے پڑھنے کے باوجود انھوں نے ایم اے، ایم آئی ای اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ایسا لگتا ہے کہ باذوق اور پڑھا لکھا جن ان کے قبضے میں ہے یا پھر وہ خود۔

مناظر عاشق ہرگانوی

انور سدید کی انشائیہ نگاری

انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے خود انور سدید نے لکھا ہے

"انشائیہ زندگی کے موجود مظاہر، اشیاء، تجربات اور معمولات کو آزادہ روی، خوش خیالی اور زندہ دلی سے دیکھنے اور اس کے انوکھے گوشوں کو نثر کے تخلیقی اسلوب، کفایتِ لفظی، غیر رسمی انداز اور دوستانہ ماحول میں پیش کرنے سے عبارت ہے۔"

زندگی کے موجود مظاہر، اشیاء، تجربات اور معمولات میں کبھی دَور خود ادیب میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی ادیب کسی عہد میں منعکس ہوتا ہے۔ انور سدید نے اپنے دَور کو اپنی شخصیت اور اپنے کارنامے سے منوّر کیا ہے۔ ان کا شمار اس زمرے میں کیا جاتا ہے جو اپنے ماضی اور خود اپنے دَور سے اکساہٹ یا کرابدی یا ایک طویل عرصہ پر محیط اقدار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے اظہار کے لیے انور سدید نے انشائیہ جیسی صنف کو اپنایا ہے۔ ملک کے سیاسی اور جذباتی طور پر مشتعل اور سماجی طور پر بیدار حالات کے تقاضے انھیں انشائیہ کی صنف کی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے دَور کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کو براہِ راست اور مؤثر انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اور معاشرے کے اجتماعی احساس کو پوری جزئیات کے ساتھ سمجھنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ واقعات سے اور کردار کے ذریعہ انھوں نے زندہ دلی پیدا کرنے کی کامیاب

کوششیں کی ہیں۔ ان کے انشائیے میں فنی رکھ رکھاؤ، مطالعہ کی وسعت اور زندگی کی ٹھوس ناہمواریوں کو ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

لفظ "کرکٹ" کو اگر لیا جائے تو آج کا بہت زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ہے اور بچے بچے کی زبان پر ہے۔ بیسویں صدی کی طغیانی زندگی میں سے اگرچہ لمحۂ فراغت نکالنا بہت مشکل ہوگیا ہے لیکن جب بھی کرکٹ کا موسم آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس صدی کی طغیانی رَو نے اپنی سمت یکدم تبدیل کرلی ہے اور اس کے داخل سے عافیت مسرت اور بہجت کے ان گنت لمحات کا فوارہ چھوٹ پڑا ہے۔ کرکٹ کا موسم آتا ہے تو زندگی کی خارجی تیز رفتاری رک جاتی ہے لیکن انسان کا داخل بیدار ہوجاتا ہے اور وہ اپنے اندر کے مست بلاوے پر کسی مخصوص سمت میں بے اختیار لپکتا چلا جاتا ہے۔ یہ بلاوا کوہِ ندا کا بلاوا نہیں کہ آدمی اس پر لبیک کہے تو واپس ہی نہ آئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے تو پتھر بن جائے۔ یہ بلاوا تو محبوب کے اس بلاوے کی طرح ہے جس میں تجدیدِ حیات کی نوید تازہ موجود ہوتی ہے اور ایک طویل ملاقات کے بعد زندگی کرنے کی نئی آرزو پیدا ہوجاتی ہے۔"

انیسویں صدی کے وسط سے اختتام تک ہندوستانی معاشرے کے انتشار کے باہمی عمل اور ردِعمل نے معاشرے میں سیاسی، مذہبی اور تہذیبی سطحوں پر بعض چیزوں کے ردّ و قبول کا ایک مخصوص رویّہ پیدا کردیا تھا۔ اور یہ رویّہ ترکیبی سے زیادہ تحلیلی نقطۂ نظر کا طالب تھا۔ انور سدید نے اس تمام تاریخی پس منظر کو کرکٹ کی نگاہ سے دیکھا اور پرکھا ہے"۔ کرکٹ میں چونکہ پوری قوم مبتلائے شوق ہوجاتی ہے اس لیے مجھے کرکٹ بجائے کھیل کے ایک بھرا پُرا میلہ نظر آتا ہے۔ یہ کھیل اگر بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں رائج ہوجاتا تو شہنشاہِ عالم پناہ کو پھول والوں کا میلہ سجانے کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ وہ قطب صاحب کے گرد و نواح میں جو طویل و عریض میدان ہے۔ اس میں کرکٹ کے پانچ روزہ مقابلوں کے انعقاد کا حکم دے دیتے اور خود قلعۂ معلی میں بیٹھ کر کرکٹ کی کمنٹری سنتے۔ افسوس کہ مغلوں نے برِصغیر میں کرکٹ اسٹیج کرنے کے بجائے اپنا ٹھاٹھ ہی سمیٹ لیا اور برِصغیر کا طویل و عریض میدان

انگریزوں کے لیے خالی کر دیا تاکہ وہ ایل بی ڈبلیو ہو جانے کے خطرے کو خاطر میں لائے
بغیر بے تحاشا اور بے محابا کرکٹ کھیلیں۔ گیند کو معمولی سا بلّہ دکھائیں اور جس سمت
میں چاہیں پھینک دیں اور پھر خود ہی باؤنڈری کی لکیر پار کرنے کا اعلان کر دیں" (اگر)
نوآبادیاتی جبر کے سیاسی اور سماجی اصولوں کے اطلاق اور مغربی علمی اور تہذیبی
اقدار پر مشرقی تہذیب کو جانچنے کے مطالبہ پر اصرار کے توسط سے ایک بچھڑے
ہوئے معاشرے کو سرمایہ دارانہ دور میں داخل ہونے کا چیلنج ملا۔ معاشی غلامی
سیاسی غلامی کا لازمی نتیجہ تھی جسے بلا احتجاج قبول کر لیا گیا۔ مگر تہذیبی غلامی کو قبول
کرنا اپنی تاریخ سے دستبردار ہونے کے مترادف تھا لہٰذا اس کی مزاحمت ضروری تھی
اس کے باوجود مغربی تہذیب نے اپنے روشن پہلوؤں یعنی عقلیت پسندی اور
جدید علوم کے سہارے مشرقی ذہن پر اپنے اثرات جمانے شروع کر دیے اور رفتہ رفتہ
ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو علم اور تہذیب کے ان عناصر کو جذب کرنے پر مائل ہو گیا
مگر جذب و کیف کی یہ حالت، تہذیب کو جانچنے کا صحیح انداز اور تاریخ سے آگاہی
کے سلسلے میں مزاحمت کی قوت انور سدید کے کہنے کے مطابق اسی وقت ممکن ہے
جب انسان "اونگھنے" کو اپنا شعار بنالے۔ انشائیہ "اونگھنا" سے یہ نکتہ آفریں
اور تخلیقی قوتوں سے بھرپور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"جب لیڈر اونگھتا ہے تو اس کی انفرادی ترقی کا راستہ کھلنے لگتا ہے
لیکن جب قوم اونگھتی ہے تو ضرور انقلاب کی راہ ہموار ہوتی ہے سالہا
سال کے غور و فکر کے بعد جونہی بدھ نے اپنے اوپر اونگھنے کی کیفیت
طاری کی تو اس پر معرفت حق کے تمام دریچے وا ہونے لگے۔ ہستی اور نیستی
کا فرق مٹنے لگا...... اونگھنے کی صوفیانہ کیفیت طاری کیے بغیر نہ تو آدمی
محشرِ خیال بن سکتا ہے۔ نہ خلوت کو انجمن سمجھنے پر قادر ہو سکتا ہے۔
اونگھنا ایک صحت مند فعل ہے۔ اس سے اعصاب کو سکون ملتا ہے،
سوچنے کی قوت بڑھتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے منصوبے اونگھتے ہوئے
سوچے گئے ہیں"

تہذیبی انتشار اور شخصی بے اعتمادی کو بھی انور سدید نے "اونگھنا" میں ہی

تلاش کیا ہے۔

"آپ تین یا چار بڑوں کی چوٹی کانفرنس کا تصور کیجئے۔ کشمیر یا ویت نام یا فلسطین کا مسئلہ درپیش ہے۔ مندوبین دھواں دھار تقریروں میں مصروف ہیں۔ دلائل و براہین کے دفتر کھل رہے ہیں۔ ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے۔ لیکن اکابر ثلاثہ یا اربعہ جن کے ناتواں کندھوں پر ساری دُنیا کے امن و امانِ عامہ کی ذمہ داری ہے۔ دانتوں میں پائپ دبائے بڑے سکون سے اونگھ رہے ہیں اور رائے شماری کے وقت انگشتِ شہادت کے ایک استرداد سے ساری دُنیا کی دائمی اونگھ میں خلل ڈال دیتے ہیں۔"

انور سدید کے انشائیے میں مواد اور اسلوب دونوں باہم گتھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں خیال کی گہرائی اور آزادہ روی کی لطیف کاٹ بھی ہے۔ ان کے انشائیے میں ظرافت کا بنیادی عنصر طنز ہے لیکن طنز میں بھی دوستانہ ماحول پیشِ نظر رہتا ہے اور طنز کی اس ذیلی رَو کے ساتھ ان کے اسلوب کا حُسن۔ قولِ محال اور حسنِ تضاد کے بے ساختہ اور برمحل استعمال سے عبارت ہے۔ وہ قاری کو متبسم کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ہر جملے پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے جاتے ہیں۔ طنز، تبسم اور گہری سوچ کی ایک مثال "مچھر کی مدافعت میں" سے دیکھئے:

"فطرت نے اس کے ہونٹوں کو خون لگا دیا ہے۔ اس لیے بالعموم ثمر آب کے قریب بھی نہیں جاتا۔ تاہم کسی محفل میں مفت کی مل جائے تو انسان ہی کی طرح بر بنائے انکسار انکار نہیں کرتا۔"

"چپڑاسی دفتر کا مستقل ملازم ہے۔ دفتر کی آرائش اور زیبائش میں اس کی کہنہ مشقی اور طویل تجربہ شامل ہے۔ فائل سے اس کی دوستی دیرینہ اور پختہ ہے چنانچہ جس فن کارانہ انداز میں فائل کے بندِ قبا چپڑاسی کھولتا ہے۔ یہ انداز کسی بڑے سے بڑے مشتاق افسر کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہر چند وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن اس کی چھٹی حس بہت مضبوط ہے۔ وہ فائل کو دیکھتے ہی بتا سکتا ہے کہ اس کے اندر کون سے افادی راز پنہاں ہیں۔ فائل چپڑاسی کی محبوبہ ہے اور اس سے

کوئی راز پوشیدہ نہیں رکھتی، اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی فائل اپنا سینہ بنات النعش گردوں کی طرح اس کے سامنے بلا توقف عریاں کر ڈالتی ہے۔"

(ذکر اس پری وش کا)

"مونچھوں کا اُگنا ایک فطری عمل ہے لیکن انھیں پالنا ایک تہذیبی فعل شمار ہوتا ہے جس طرح معاشرے کی انفرادی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اسے تہذیب کی درانتی سے کاٹنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مونچھوں کی تراش میں سلیقہ نہ برتا جائے تو یہ اُلجھے ہوئے معاشرے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور شخصیت کو اُبھارنے کے بجائے اسے دبانے لگتی ہیں۔ خوبصورت انداز میں تراشیدہ مونچھیں تو مرد کے چہرے کا زیور ہیں۔" (مونچھیں)

انور سدید زبان کی سلاست، بیان کی وضاحت اور خیال کے حُسن کے توسط سے امکانات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان کے فن کا راز صحیح الفاظ کے برمحل استعمال میں پوشیدہ ہے اور ان کی نظر بہت باادب مگر بے باک بھی ہے۔

"میں نے اپنی خواہشات کا تجزیہ کبھی نہیں کیا۔ تجزیہ کرنے سے خواہشیں اپنا اصل رنگ کھو دیتی ہیں۔ خواہشوں کے ہزاروں رنگ اور سینکڑوں رُوپ ہیں۔ خواہشیں تو بادل کی طرح لچکیلی اور نرم ہوتی ہیں، جو لاشعور کے سمندر سے اٹھتی ہیں اور پھر بلندی پر پہنچ کر آپ کی شخصیت کے پورے کُرّے کو اپنے حصارِ مسرت میں لے لیتی ہیں۔ یہ ہر لحظہ نیا پیکر تراشتی اور آپ کو نت نئے جلووں سے مسحور کرتی ہیں۔ یہ کبھی سمندر کی طرح گہری اور پُرسکون ہوتی ہیں اور کبھی مفلس کی جیب کی طرح کھوکھلی اور مضطرب، دونوں صورتوں میں خواہشیں موجود سے نبرد آزما رہتی ہیں اور حسبِ آرزو ایک نیا موجود تشکیل دینے کی کوشش کرتی ہیں۔"

(ہزاروں خواہشیں ایسی)

انور سدید کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے اور تازگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے

"اس وقت میں اپنے جسم کو کھردری چارپائی پر چھوڑ دیتا ہوں اور روح کے آزاد سفر پر روانہ ہو جاتا ہوں اب میری منزل نہ زمینوں پر ہے نہ آسمانوں پر بلکہ میں خلا کا ایک مسافر ہوں جس کا دل ستاروں کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔

اب یہ مٹی کا بیمار اور بدہیئت ٹکڑا نہیں رہا بلکہ مجسم نور بن گیا ہے۔ اس سے مدھم دودھیا روشنی نکل رہی ہے۔ یہ روشنی زمین کے محیط پہ ایستادہ ہونے کے باوجود ان گنت ستاروں کی روشنی میں مدغم ہو رہی ہے اور کہکشاں اس راستے کو استوار کر رہی ہے جو ان تمام روشنیوں کو جلو میں لے کر ساتویں آسمان کو جاتا ہے۔"

(تاروں بھری رات)

طنز کا مقصد صرف تمسخر نہیں بلکہ اصلاح بھی ہے۔ اس کی بنیاد ناپسندیدگی یا نفرت کے اس جذبہ پر ہے جو وسعت پا کر آفاقی ہو جائے۔ مکمل طنزیہ اسلوب اور طنزیہ رنگ کی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں۔ انور سدید کے یہاں طنز بھرپور، گہرا اور آفاقی اسلوب لیے ہوئے ہے۔"

"ہمارے سب سے بڑے قومی شاعر اقبال نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد مومن میں جن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے وہ سب شیطان میں موجود ہیں۔ وہ خودی کو بلند رکھتا ہے، جھپٹتا ہے، پلٹتا ہے اور پھر جھپٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شیطان کے نزدیک یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ نہیں بلکہ ایک طرز حیات ہے۔"

(غلطی کرنا)

"دسمبر انسانی تہذیب کے ارتقا کی علامت ہے لیکن جون انسان کے اولین حیوانی دور کا مظہر ہے۔ جون میں انسان کلچر سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے سارے آداب بھول جاتا ہے اور بدن کا فطری لباس زیب تن کر کے ہڈیوں کے چٹخنے کی پروا کیے بغیر اپنے بالوں بھرے جسم کو زمین کی خوشبودار مٹی میں روندنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں انسان ایک بار پھر آدمؑ کی طرح اکیلا ہو جاتا ہے۔ تہذیب کے جملہ لوازم پر تین حرف بھیج کر کھلے میدان کو اپنا مسکن بناتا ہے اور تاروں کی چھاؤں تلے، بیوی بچوں سے بے نیاز تنہائی کی گپھا میں ڈوب جاتا ہے۔ مردم بیزاری کے اس لمحے میں بیوی اگر پنکھا لے کر قریب آنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی بے رحمی سے دھتکار دی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جون کا یہی وہ مہینہ تھا جس نے گوتم بدھ کو گھر سے نکل بھاگنے کی ترغیب دی تھی۔"

(دسمبر)

با محاورہ اور شستہ زبان، لہجے کی بے باکی اور اظہار کی صفائی جیسے جوہر کے ساتھ انور سدید نے اپنی نظر کے دائرے کو بے حد وسعت دی ہے:

"پڑوسی ایک ایسی مخلوق ہے جو معاملے کو ذاتی فائدے کے علاوہ کسی اور نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ سچ میں چونکہ زیاں ہی زیاں ہے اس لیے پڑوسیوں کو ایک نظر نہیں بھاتا۔ اور اگر کبھی آپ سچ کا ارتکاب کر ڈالیں تو پڑوسی کوس کوس کر آپ کا جینا حرام کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے محلّے میں کسی شریف آدمی نے سمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا ہے اور آپ اسے پیشے کی معتبر نما سبت سے "سمگلر" قرار دیتے ہیں تو بظاہر یہ ایک ایسا سچ ہے جو گرائمر کے اعتبار سے بھی درست ہے لیکن یہ کڑوی گولی آپ کے پڑوسی کے حلق سے قیامت تک نہیں اترے گی اور اسے اس وقت تک ہرگز چین نہیں آئے گا جب تک کہ وہ آپ کے آباؤ اجداد کو سمگلروں کے زمرۂ شرفاء میں شامل نہ کر لے گا۔ پس کیا اس سچ کو آپ کی حماقت قرار دینا مناسب نہیں؟ اس کے برعکس اگر آپ اپنے اس معتبر پڑوسی کا تعارف ایک نامور امپورٹر اور ایک معتبر ایکسپورٹر کے طور پر کرائیں گے تو یقیناً آپ کو اپنے منہ کا زاویہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کے آباؤ اجداد کی عزّت محفوظ رہے گی۔" (جھوٹ سچ)

"میں سچ سے بے اندازہ محبّت کرتا ہوں لیکن میں زہر کا جام تھامنے کی ہمّت نہیں رکھتا۔ مجھے نیزے کی انّی سے خوف آتا ہے۔ اس لیے میں سچ کو پسند نہیں کرتا۔ جھوٹ مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں اس سے بے دریغ نفرت کرتا ہوں، لیکن جھوٹ میرے گرد و پیش میں ہر جگہ موجود ہے۔ میں اسے محسوس بھی کرتا ہوں۔ یہ مجھے نظر بھی آتا ہے، لیکن میں اسے دھتکار کر پرے ہٹانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" (جھوٹ سچ)

اندرونی اور بیرونی عوامل نے آج ہمارے معاشرے کو طبعی، نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے بیحد پیچیدہ بنا رکھا ہے۔ انور سدید واقعات اور مسائل کی ان پیچیدگیوں میں مزہ لیتے ہیں۔ لیکن زندگی کے موجودہ طور طریق کو وہ سمجھتے ہیں۔

"میرا تجربہ ہے کہ غیر متعارف لوگوں سے بامعنی یا بے معنی اختلاف کرنا عقلمندی کی نشانی ہے لیکن اختلاف جب دوستوں پر عمل میں لایا جائے تو قرض کی طرح محبت کی قینچی ثابت ہوتا ہے۔"
(فٹ نوٹ)

"کل صبح جب میں اپنے منجھلے بیٹے کی اُنگلی تھامے باغ میں سیر کے لیے گیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی بوسیدہ لباس پہنے، دبیز چشمہ لگائے، موٹی سی سفید چھڑی ہاتھ میں لیے وسطی روش پر ٹہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ملکوتی چمک اور چہرے پر بے پایاں تقدس تھا۔ کمر کی خمیدگی کے باوجود وہ ایک عجیب سے احساسِ تفاخر سے سر اٹھا کر چل رہا تھا۔ اس کی راہ میں بے شمار کانٹے پڑے تھے لیکن اس کے قدم لغزیدہ نہیں تھے، میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اور سامنا ہوتے ہی خوشی سے بے دم ہو ہوگیا۔" ارے یہ تو میرا محسن دیرینہ بوڑھا سچ ہے۔"
میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں لپک کر اس سے بغلگیر ہوگیا۔ اسی لمحے میرے بیٹے نے اپنی انگلی چھڑا لی اور یہ کہتے ہوئے بھاگ گیا۔" ابو یہ تو ہمارا ہیڈ ماسٹر ہے۔"
(جھوٹ سچ)

انور سدید کے انشائیے نفسیاتی تسکین دیتے ہیں۔ فرد کے احساسات اور خیالات کے موازنہ میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور تصورات، نظریات اور معتقدات کو معقولیت بخشتے ہیں۔

وہ نہ صرف سب چیزوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں، بلکہ اس بات پر بھی آمادہ کرتے ہیں کہ جن باتوں کو ہم فراموش کر چکے ہیں۔ ان کو دوبارہ تازہ کیا جائے اور ایسی اشیا جن سے ہم واقف ہیں اور جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ انھیں روشنی میں لایا جائے!

منظر علی خاں۔

"...... اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

(انور سدید کا خاکہ نما)

صاحبو! جنگجو کے ہاتھ میں تلوار بے شک نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ہاتھ خالی ہیں یا وہ تلوار اُٹھا نہیں سکتا یا چلا نہیں سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فی الوقت بجائے تلوار کے قلم سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہر چند کہ دورانِ جنگ کچھ مواقع ایسے بھی آئے کہ جب تلوار کا استعمال ناگزیر نظر آنے لگا تھا ـــــ لیکن پھر شُدنی ٹل گئی۔ شُدنی کا ٹل جانا اور بات ہے اور شُدنی کا "ناشُدنی" میں بدلنا اور بات ہے جس کے امکانات اس صدی کے آخر تک بلکہ آئندہ صدی کے درمیان تک نظر نہیں آتے۔ اللہ ربّ العزّت جُملہ جنگجویانِ دبستانِ ایں و آں کو درازیٔ عمر عطا کرے اور صحتِ کاملہ سے نوازے۔ آمین

میرے یہ تمہیدی الفاظ نفسِ مضمون سے گرچہ بہت زیادہ لگّا نہیں کھاتے لیکن اب ایسے لاتعلق بھی نہیں ہیں کہ قاری کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ میں کہنا کیا چاہ رہا ہوں....

...... مثلاً اپنے وطنِ عزیز میں مذہب کے حوالے سے سلام و قیام کی بات آئے گی تو خیال حضرت مولانا شاہ احمد نورانی مدظلہٗ تعالیٰ کی جانب فی الفور مبذول ہو گا۔ سیاست کے حوالے سے مزاح کا ذکر ہو گا تو دھیان محترم عالی مقام جناب پیر مردان شاہ پگارا شریف کی طرف جائے گا، ادب میں انشائیے کی بات چلے گی تو ذکر صرف اور صرف

جناب ڈاکٹر وزیر آغا کا نکلے گا۔ بشرطیکہ گفتگو سرگودھا کے اطراف میں ہو! یوں اور دوسرے مواقع پر بھی لوگ جناب آغا صاحب کا ذکر نکال بیٹھتے ہیں لیکن انشائیہ بہرحال انشائیہ ہے اور چیزوں میں وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ـــ!

اسی طرح شعر و ادب میں مبارزطلبی اور زجر و توبیخ کا شور ہوگا تو خیال ایک ہی شخصیت کی طرف جائے گا، نامِ نامی و اسمِ گرامی تا حال جن کا ڈاکٹر انور سدید ہے۔ آپ کے اور بھی کئی نام ہیں جو ان کے والدین سے لے کر ان کے بہی خواہوں اور بدخواہوں نے رکھے ہیں اور ماشاء اللہ سب ایک سے ایک ہیں۔ لہٰذا مختلف معاملات میں مختلف نام اُچھالے جاتے ہیں یا وہ از خود اچھل پڑتے ہیں۔ دُنیائے علم و ادب میں جتنی فہرستیں مختلف کار ہائے نمایاں کے سلسلے میں دانشورانِ ادب نے بنائی ہیں ان سب میں آپ کا نام ممتاز درجہ پر موجود ہے اور جس فہرست میں وہ موجود نہیں اس فہرست کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ "Genuine" نہیں۔ نظر نظر کی بات ہے...... ویسے میں دانشور دانشور کی بات بھی کہہ سکتا تھا ـــــ تو صاحبو! میں آج جس ہستی کا ذکر کرنے چلا ہوں انہیں کئی میدانوں میں مصروفِ کار بلکہ مصروفِ پیکار و نبرد آزما دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ میدانِ شعر و سخن ہو کہ صحرائے انشا پردازی، دبستانِ کالم نگاری ہو کہ چمنِ تنقید نگاری صحنِ مزاح نگاری ہو کہ برآمدۂ طنز نگاری، شاہراہِ افسانہ نگاری ہو کہ کوچۂ مکتوب نگاری آپ کسی گلی میں بند نہیں بلکہ کئی بند گلیاں تو خود انہوں نے کھولی ہیں جہاں اب دوسرے چہل قدمی فرما رہے ہیں۔

قارئینِ کرام! وجۂ شہرت یا وجودِ شہرت پر پائندۂ شہرت کا زور نہیں یعنی یہ وجوہ کبھی بھی اور کہیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں، کبھی برسوں مانگنے سے کچھ نہیں ملتا کبھی بغیر مانگے پیمبری مل جاتی ہے۔ کبھی شب و روز خود قلم گھسیٹتے رہو تو کوئی نہیں پوچھتا اور کبھی دوسرے لکھ ماریں تو چہار دانگ عالم میں چرچا ہونے لگتا ہے۔ جنابِ انور سدید کے بارے میں یہ تو کہا نہیں جاسکتا کہ ان کے اشہبِ قلم نے معرکۂ ادب سر نہیں کئے لیکن یہ ضرور ہے کہ اشہبِ قلم کو مہمیز کسی اور کی نوکِ قلم سے لگی ہے۔

صاحبو! میرے سامنے آج یوں تو کئی کتابیں ہیں لیکن ان سے جھلکتی ہوئی شخصیت

صرف ایک ہے کہ جس شخصیت کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ میں سب سے پہلے اپنی بات ایک حسین کتاب سے شروع کرتا ہوں نام جس کا "وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام" ہے۔ جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں تو بے شمار خطوط لکھے ہیں، اور کچھ آغا صاحب ہی پر موقوف نہیں خطوط تو ان لوگوں نے بھی لکھے یا لکھوائے ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔ یہ سلسلہ بڑا پرانا ہے، حضرتِ غالب خط لکھنے لکھانے سے منسلک رہ چکے ہیں ؎

کوئی خط اس کو لکھوائے اگر تو مجھ سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے!

آغا صاحب چونکہ غالب کی طرح خود ہی شاعر اور نثار ہیں بلکہ غالب سے ماسوا انشائیہ نگار بھی ہیں لہٰذا گمان غالب ہے کہ انھوں نے خطوط خود ہی لکھے ہوں گے، غالب کو زحمت نہ دی ہوگی۔

بہرحال، جناب انور سدید نے آغا صاحب کے جو خطوط چھاپے ہیں وہ میں نے کچھ اِدھر اُدھر سے پڑھے ہیں۔ ظاہر ہے پرائیویٹ "چیزوں" کو اگر اِدھر اُدھر سے دیکھ لیا جائے تو کہتے ہیں چنداں مضائقہ نہیں ہاں تفصیلی جائزہ مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ جناب آغا صاحب نے یوں تو انور سدید کے بارے میں بے شمار باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے انھیں بھی دلچسپی ہو سکتی ہے جنھیں "پبلک" میں شمار کیا جاتا ہے لیکن کچھ چیزیں صرف "مخصوصین" کی دلچسپی کے لیے بھی ہیں۔ آئیے ایک ایک کرکے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

جناب انور سدید کے نام اپنے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء کے خط میں آغا صاحب لکھتے ہیں:

"خوشی ایک تو اس لیے کہ اُردو کو ایک نیا نقاد میسر آیا اور اس لیے بھی کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔"

آغا صاحب کا خوش ہونا بجا لیکن بے چاری اُردو سے کون پوچھے کہ مزید ایک عدد نقاد کی آمد اس کی جان کو اور کتنے روگ لگائے گی! رہا آغا صاحب کے "اندازے" کا صحیح ہونا تو وہ عموماً صحیح ثابت ہوتا ہے۔ مستثنیات کی بات اور ہے! اگر آغا صاحب کے اندازے پر کچھ لوگ صحیح نہ اُتریں تو ملال کیسا؟ ان حضرات کو بھی تو یہ غم ہے کہ آغا صاحب ان کے اندازے سے بہت پرے نکلے۔ اور سارا فساد سنا ہے اندازوں ہی کا ہے۔

بات ہو رہی ہے جناب انور سدید کی جن کے متعلق آغا صاحب اپنے ایک خط مورخہ

۱۷ر اگست ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

"لگتا ہے کہ محکمہ نہر کی کانِ نمک میں آپ بھی نمک ہونے لگے ہیں"

جناب انور سدید کے "نمکین" ہونے کا عمل تو تقریباً دو جگ قبل شروع ہوا تھا۔ اور سال دو سال میں پورا بھی ہو گیا تھا..... لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کے مرزح ہونے کا عمل شروع ہوا جو تا حال جاری ہے اگر کسی کو مرچ کی تیزی کے پرکھنے کا شوق ہو تو جناب ڈاکٹر سلیم اختر سے رجوع کرے۔ بات ڈاکٹر سلیم اختر کی نکل آئی ہے تو سوچتا ہوں کہ چند الفاظ یہاں پر ان کے بھی نقل کر دوں کہ ہر دو دبستانوں کو شاید ان سے دلچسپی ہو۔ اپنی نئی کتاب "کڑوے بادام" میں "مَیں" کے عنوان تلے انہوں نے کچھ گفتگو اپنی ذات پر اپنے خواب کے حوالے سے کی ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"آج سفید سر، ۳۵ کتابوں، ایک بیوی اور تین بچّوں کے ساتھ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو وہی خواب والی عورت مکمل ترین بے حجاب حسن کے ساتھ نظر آتی ہے۔"

قطع نظر اس کے کہ سفید سر میں اگر "مکمل ترین بے حجاب حسین عورت" کا خواب نظر آنے لگے تو پاس پڑوس میں بسنے والی بے اولاد خواتین کیا حصولِ اولاد کی خاطر تعویذ کے لیے صاحبِ سفید سر سے رجوع کریں گی کہ نہیں ــــــ ابھی دیکھنا یہ ہے کہ جناب انور سدید کے ساتھ یہ صورت حال ہوتی تو وہ اسے کس طرح دیکھتے! میرے خیال میں وہ اسے کچھ یوں قلم بند کرتے کہ "آج صاف و شفاف سر، کئی درجن کتابوں، چار چلتے پھرتے اور اچھلتے کودتے انشائیوں[1] اور حتی المقدور تعدادِ زوجگان کے ساتھ جب پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں تو وہی خواب والے لوگ بار بار نظر آتے ہیں جو اگر اسی تواتر سے جلتی جاگتی زندگی میں نظر آنے لگیں تو زندگی کے تسلسل کے لالے پڑ جائیں"۔

میرے خیال میں اب براہِ راست جناب انور سدید کے بارے میں گفتگو ہونی چاہیئے

---

[1] جنابِ انور سدید کی نگاہ میں ان کی اولاد کا شمار انشائیوں میں ہوتا ہے۔ حوالے کے لیے "انشائیہ اُردو ادب میں" تصنیف ڈاکٹر انور سدید ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کے لیے پھر جناب ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط سے مدد لینا ہوگی۔ انھوں نے اپنے ۵ اردسمبر ۶۶ کے خط میں جناب انور سدید کو لکھا ہے کہ "یہ میدان (تنقید کا) آپ کے سامنے کھلا پڑا ہے، آئیے اور سیزر کی طرح اسے ایک نظر دیکھ کر فتح کر لیجئے۔" بعد کی اطلاعات یہ ہیں کہ جناب انور سدید نے سیزر کی طرح نہ دیکھنے کا کھکیڑ پالا اور نہ میدانِ جنگ تک جانے کی زحمت گوارا کی۔ ہاں میدانِ جنگ خود چل کر ان کے پاس آ پہنچا تو یہ اور بات ہے۔ بہرحال وہ مسلسل اپنی فتوحات میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ سنا ہے اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ سیزر نے اپنی گدّی ان کے حوالے کرنے کی ٹھان لی ہے لیکن جنابِ انور سدید اس پر بیٹھنے سے قبل بروٹس کا معقول انتظام کرنا مقدّم خیال کرتے ہیں لہٰذا یہ مسئلہ جوں کا توں پڑا ہے۔

اپنے ۲۷ جولائی ۱۹۶۷ء کے خط میں جناب وزیر آغا لکھتے ہیں کہ "آپ نے اپنی آمد کے لیے بڑی مبارک تاریخ منتخب کی ہے اگر میں غلطی نہیں کرتا تو دوسری جنگِ عظیم غالباً تین تاریخ ہی کو شروع ہوئی تھی۔"

یہاں میرے خیال میں آغا صاحب رعایت کر گئے ورنہ عام خیال یہ ہے کہ جنگِ عظیم دوم شروع ہی جنابِ انور سدید نے کرائی تھی اور ایک جنگِ عظیم دوم پر موقوف نہیں اس قبیل کی اور دوسری کارروائیوں میں بھی کہیں نہ کہیں ان کا ہاتھ ضرور موجود ہوتا ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں رقیبوں کے کیمپ سے توپ کا نیا گولہ الموسوم بہ "آئینہ" داغا گیا۔ جس کے جواب میں ادھر سے بھی کئی میزائیل چھوڑے گئے جن کی تیاری انھی نسخہ جات کے مطابق عمل میں آئی۔ جنھیں جنابِ انور سدید نے برسوں کی عرق ریزی کے بعد تحریر کیا ہے۔

جنابِ انور سدید کے نام ۴ اگست ۱۹۶۸ء کے مکتوب میں آغا صاحب کی برادرانہ جھنجھلاہٹ ملاحظہ کیجئے۔ لکھتے ہیں: "آپ کا خط ملا۔ یہ آپ نے کمال کر دیا کہ بھابی صاحبہ کو میرے فقرے کا غلط مفہوم سمجھا دیا، میرا مطلب تو یہ تھا کہ ان سب کو ساتھ لائیے، مگر ادیب شاید ازل سے ہی خود غرض ہے اس لیے اپنے مطلب کا مطلب نکال لیا ہے۔ بہرحال اب پانی سر سے اوپر جا چکا ہے تو بھگتیے۔"

جاننے والے جانتے ہیں کہ انور سدید صاحب اتنے لوگوں کو صحیح مطلب سمجھاتے رہتے ہیں کہ ایسے میں "بھابی صاحبہ" کے لئے (میرا مطلب

بیگم انور سدید ہے) یعنی ہماری بھابی صاحبہ کے لیے بجز غلط مفہوم کے اور کچھ باقی نہیں رہتا وہ بیچاری اوّل روز سے اسی مفہوم سے کام نکال رہی ہیں۔ ایسے میں برادرم انور سدید کا کام اگر تلپٹ ہوجائے تو شکایت کیسی ــــ! ڈاکٹر انور سدید میری معلومات کی حد تک بڑے بار باش آدمی واقع ہوئے ہیں۔ دوستوں کی تلاش میں لاہور پاک ٹی ہاؤس کی ان تقاریب میں وہ ضرور شامل ہوتے ہیں جہاں اپنی چائے کی قیمت ہر شریکِ محفل خود ادا کرتا ہے۔ یہ ادائیگی اگر وہ کرے جس نے محفل میں اپنا کلام، مضمون یا افسانہ سنایا ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ "آج وہ کل ہماری باری ہے"۔ لیکن وہاں تو ان سے بھی پیسے رکھوا لیتے ہیں جنھیں پیسوں کے علاوہ اور کسی چیز کا کبھی ادراک نہیں ہوا۔ "اجتماعی خورد و نوش" کے علاوہ انفرادی طور پر بھی جنابِ انور سدید دوستوں کو اپنے کھانے پینے میں شامل رکھتے ہیں۔ بسا اوقات دوستی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر خود کم کھاتے ہیں اور دوستوں کو زیادہ کھانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر محترمہ عذرا اصغر اور برادرم اظہر جاوید ان کے ساتھ تھے ــ حوالے کے لیے "غالب کے نئے خطوط" مصنفہ انور سدید کا انتساب ملاحظہ کیجئے جو کچھ یوں ہے: "ماہنامہ تخلیق" لاہور کے مدیران عذرا اصغر اور اظہر جاوید کے نام جنہوں نے غالب کے نئے خطوط ماہنامہ تخلیق میں شائع کیے اور وہ بٹیر کھانے میں میرے ساتھ شریک ہوئے"۔

بٹیر کھانے کے لیے تو جنابِ انور سدید مدیرانِ "تخلیق" کو مدعو کرتے رہے لیکن بہاری کباب کی دعوت میں وہ صرف مخدومی مشفق خواجہ کو ساتھ رکھتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ "بہاری" خواجہ صاحب کو بہت عزیز ہیں جو کباب لگانے میں بھی لاثانی ہیں اور دل لگانے میں بھی لاجواب ــ! جنابِ مشفق خواجہ کا ذکر آیا ہے تو جنابِ انور سدید کے متعلق ان کے تاثرات پیش کرنا چاہوں گا۔ "غالب کے نئے خطوط" کے فلیپ پر خواجہ صاحب یوں رقم طراز ہیں:

"اِن خطوط میں جگہ جگہ ادبی شخصیات کا ذکر ہے اور انداز وہی غالب والا ہے کہ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے......" غالب تو خیر اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے پیش دستی کا

اعتراف بھی کیا ہے لیکن انور سدید کے ہاں معاملہ چھیڑ چھاڑ تک ہی رہتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھتا ......"

محققین ادب اس سلسلہ میں جو دُور و نزدیک کی کوڑی لاتے ہیں وہ خواجہ صاحب کے خیال کی تائید نہیں کرتی ، یعنی کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بات چھیڑ چھاڑ تک تو ضرور رہتی ہے لیکن انور سدید صاحب چونکہ مختلف اصناف انس و ادب سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ لہٰذا چھیڑ چھاڑ کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ یہ کام دوسرے انجام دیتے ہیں ذات انورِ سدید صاحب ہی کی تختۂ مشق بنتی ہے۔ ادبی حس کے حصولِ تسکین کا یہ ذریعہ بھی بُرا نہیں۔ دوسرے مکتبۂ فکر کے خیال میں بات نہ صرف چھیڑ چھاڑ سے آگے بڑھ جاتی ہے بلکہ بجائے پیش دستی کے پلش دستے تک پہنچتی ہے۔ ایسے میں انور سدید صاحب کے ہاتھوں رقیبانِ دل آرام کے "آئینے" سلامت رہیں، کہاں ممکن ؟؟

اس مختصر سے مضمون کو میں جنابِ ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک شعر پر ختم کرنا چاہوں گا کہ بات بھی انہی کی تحریر سے شروع ہوئی تھی۔ اس شعر میں نظریۂ ضرورت کے تحت معمولی سی تحریف کی گئی ہے بہر حال آغا صاحب نے جنابِ انور سدید کے لیے جس نیک تمنّا کا اظہار اس شعر میں کیا ہے وہ برقرار ہے اور جنابِ انور سدید بھی ہمہ وقت اس تمنّا کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ شعر ہے :-

ہے تمنّا کہ سدا برسرِ پیکار رہیں
وہ مقابل رہیں ہم آئینہ بردار رہیں

دوسرے مصرعہ میں آئینہ برداری کے فرائض آغا صاحب نے شاید اس لیے سنبھالے ہیں کہ لوگ اس آئینہ کے طفیل اپنی صورت اور اپنے حُسن سے آگاہ اور مطمئن ہوں، تو جنابِ انور سدید کے مقابل آئیں۔ یہ طے ہے کہ آمد و رفت کے اخراجات دبستانِ سرگودھا و اکادمی ادبیاتِ پاکستان مشترکہ طور پر اُٹھائیں گے ، لوگ یقین کریں !

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی

انور سدید: ایک نقّاد، ایک محقّق

برِّ عظیم پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں انور سدید کا نام نیا نہیں۔ اُردو ادب سے ان کا رشتہ و رابطہ کم و بیش ۳۵، ۴۰ برسوں پر محیط ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز "ہمایوں" اور "نیرنگِ خیال" میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے افسانہ نگاری کے علاوہ، کبھی کبھار غزل گوئی کا رُوپ اختیار کیا۔ ایک زمانے میں وہ انشائیہ نگاری کی طرف مائل ہوئے تو انھوں نے نہایت خوبصورت اور کامیاب انشائیے لکھے۔ ان کے افسانے، غزلیں اور انشائیے خاصے کی چیزیں ہیں۔ مگر ان کے اصل جوہر تنقید میں آکر ظاہر ہوئے۔ تنقید نگاری ان کا فطری ذوق ہے اور اس کی آبیاری انہوں نے وسیع و عمیق مطالعے سے کی ہے۔ جس نے ان کی تنقیدی بصیرت کو جلا بخشی اور اور ان کی تنقید کا رشتہ تحقیق سے قائم ہوا۔ اب تنقید و تحقیق ہی ان کی ادبی تگ و تاز کا اصل میدان ہے۔

"فکر و خیال" (۱۹۷۱ء) اور "اختلافات" (۱۹۷۵ء) جنابِ انور سدید کے منتخب تنقیدی مقالات کے مجموعے ہیں۔ گو یہ ان کی ابتدائی تصانیف تھیں، لیکن ان کے حوالے سے وہ "اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ناقدانِ کرام سالوں کی جانفشانی اور رخجالت کے بعد پہنچتے ہیں۔" (وزیر آغا)۔ ان مجموعوں میں حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔ تہذیب و فلسفہ، نظری تنقیدی مباحث، ادبی تحریکوں، افسانے، شاعری، انشائیے اور

تاریخِ ادب پر عملی تنقید اور ادبی جائزے وغیرہ ۔ اپنی پہلی کتاب "فکر و خیال" انھوں نے "ادب کے ایک معمولی طالب علم" کی حیثیت سے پیش کی تھی، چنانچہ اس طالب علم کی علمی لگن، کاوش و جستجو اور ذوقِ مطالعہ، دقّتِ نظر، تنقیدی تحلیل و تجزیے کی صلاحیّت اور بااعتماد و پُر تیقن لہجے کا خوبصورت نقش پیش کرتی ہے۔

راقم کو انہی دنوں ہندوستان سے ایک صاحب کے تین دبلے پتلے تین تنقیدی مجموعے موصول ہوئے۔ ایک کتاب میں ان کی تصانیف کی فہرست درج ہے معلوم ہوا موصوف تقریباً دس برس سے تنقید لکھ رہے ہیں، ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور چار مزید مجموعوں کے مصنّف ـــــ یعنی دس برس میں سات تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ فی کتاب چودہ پندرہ مضامین اور ہر مضمون اوسطاً آٹھ دس صفحوں پر مشتمل ہے۔ گویا تنقید کا چھوٹا موٹا کارخانہ ہے، جو کھٹا کھٹ چل رہا ہے۔ جونہی دس بارہ مضامین تیار ہو گئے۔ جنابِ ناقد نے نئی کتابوں پر تین چار تبصرے گھسیٹ دیے ان کے ساتھ ایک دیباچہ ٹانک دیا اور مجموعہ تیار ہو گیا ـــــ قارئینِ کرام! غور فرمائیں تو اُردو تنقید کے نام پر وجود میں آنے والا رطب و یابس بیشتر اسی نوعیت کا ہے۔

"فکر و خیال" اور "اختلافات" کو آپ یکسر مختلف پائیں گے۔ جنابِ انور سدید کے ان مجموعوں کے نام ہی معنی خیز ہیں گو ۱۹۷۵ء کے بعد ان کا کوئی تنقیدی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ (اور یہ باعثِ تعجب ہے کیونکہ اس عرصے میں انھوں نے خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔) مگر "فکر و خیال" ان کی تحریروں میں مسلسل روبہ عمل ہے اور اس نے ان کے اندر "بعض موضوعات کے تفصیلی اور سلسلہ وار مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔"

(دیباچہ فکر و خیال)

"اختلافات" میں ان کے ہاں تنقید کے ساتھ ساتھ جستجو اور تحقیق کا ایک رجحان نمایاں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض فکری مسائل و موضوعات پر سوچ بچار (خیر و شر کا مسئلہ، پاکستانی ادب کا مسئلہ، کیا الفاظ کی تہذیب زندہ رہے گا؟) اور بعض ادبی کاوشوں کا جائزہ (تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند، ادبی رسائل کے پچیس سال) اسی رجحان

کی غمازی کرتے ہیں ـــــــ تحقیقی مقالے کی تیاری میں جناب انور سدید کا ذوقِ تحقیق مزید نکھرتا اور پختہ ہوتا گیا۔ چنانچہ ان کی بعد کی کاوشوں میں تحقیق کو تنقید کے ساتھ برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ ادب میں تحقیق کی حیثیت ایسی بنیاد کی ہے جسے نظر انداز کر کے کوئی قابلِ لحاظ تنقیدی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی، اور نہ کوئی عمارت استوار رہ سکتی ہے۔ بعض اوقات کسی تحقیقی دریافت سے تنقیدی عمارت کا پورا نقشہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دنیائے ادب میں تحقیق کی اس ناگزیر حیثیت کا احساس جنابِ انور سدید کی تنقیدی تصانیف میں نمایاں ہے۔ "اُردو ادب کی فکری تحریکیں"، "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" (۱۹۸۲ء) "انشائیہ اُردو ادب میں" (۱۹۸۵ء) "تاریخ ادب اُردو" (زیرِ طبع) اور "اُردو ادب میں سفرنامے کی تاریخ" فی الحقیقت تنقید و تحقیق کا امتزاج ہیں۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ انور سدید کے دورِ اوّل کے بعض مضامین نے، بعد ازاں تفصیلی مطالعوں اور مستقل کتابوں کی صورت اختیار کی۔ "فکر و خیال" کا پہلا مضمون "اُردو ادب کی فکری تحریکیں"، ڈاکٹریٹ، کے لیے تحقیقی مقالے کا موضوع بنا۔ "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" پھیل کر پوری کتاب کی شکل میں سامنے آئے۔ "اُردو انشائیہ" کو انھوں نے وسعت دے کر "انشائیہ اُردو ادب میں" کے نام سے مرتب کیا۔ گویا جنابِ انور سدید کے ہاں "فکر و خیال" کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس دورِ انتشار میں سوچ بچار اور اس کے نتیجے میں وسعتِ فکر اور ارتقائے خیال کی یہ صورت معمولی بات نہیں ہے۔ اس مزاج و ذوق کی بدولت انور سدید صاحب نے اپنے خیالات اور اپنی آراء کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ چنانچہ وہ برابر اپنی تحریروں پر نظرِ ثانی کرتے رہے ـــــــ یہ صورت ان کی متعدد تحریروں (خاص طور پر "اُردو ادب کی فکری تحریکیں") میں نظر آتی ہے ـــــــ اپنے لکھے پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا احساس اور اپنے خیالات سے رجوع کی مثالیں ادبی دُنیا میں خال خال ہی ملیں گی۔ اس کا بڑا سبب کشادہ نظری اور عالی ظرفی کا فقدان ہے۔ اور یہ ہماری علمی و ادبی دُنیا کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ایسے میں جنابِ انور سدید کا متذکرہ بالا رویّہ نہایت مثبت اور مسرّت افزا ہے۔

تعصبات سے کلیتاً ماورا ہونا، غالباً انسانی فطرت کے لیے ممکن ہی نہیں، لیکن

کسی نقطۂ نظر سے اختلاف کرنا، اختلاف کو برداشت کرنا، اور دوسروں کو اختلاف کا حق دینا کشادہ ظرفی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ انور سدید قاری کو اختلافِ رائے کا حق دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "زندگی، معاشرہ اور ادب کے لیے اختلافِ رائے بے حد اہم ہے"۔ (دیباچہ "اختلافات")

قدرتی طور پر وہ خود بھی دوسروں سے اختلاف رکھنے کا حق مانگتے ہیں۔ اپنے اسی استحقاق کی بنا پر انھوں نے ادب میں تنگ نظری، تعصّب اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے، چنانچہ صاف گوئی، بے باکی، بے خوفی ان کے مضامین کا بڑا وصف ہے۔ یہ وصف کبھی کبھی برہنہ گفتاری کی حدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، انھوں نے بہت سے افراد اور تحریکوں سے بھرپور اختلاف کیا اور اس کے واشگاف اظہار میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کی خوبیوں کے اعتراف میں بھی بخل نہیں رکھا۔ "اختلافات"، "انشائیہ اردو ادب میں" اور "اُردو ادب کی فکری تحریکیں" میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ اسی ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر سلیم اختر کی آرا سے بھی استشہاد کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی آرار کو اپنی تصانیف کے فلیپ پر بطور "سند" درج کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ جنابِ انور سدید سے اختلاف رکھنے والوں کے ہاں ایسی مثال نہیں مل سکے گی۔

تنقید سے تحقیق کی طرف ان کے میلان کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ محض مضمون نگاری کو اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ناکافی سمجھتے ہوئے انور سدید نے یک موضوعی مطالعوں پر توجہ مرکوز کی۔ مضامین کے پہلے دو مجموعوں کے بعد ان کی تقریباً ساری تصانیف یک موضوعی مطالعے ہیں۔ (ان کا ذکر اوپر آچکا ہے) "اقبال کے کلاسیکی نقوش" (۱۹۷۷ء) بظاہر پانچ مقالات کا مجموعہ ہے، مگر اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں علامہ اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ حیثیتوں اور برِصغیر پاک و ہند کی ملّی و سیاسی تاریخ میں ان کے کردار و اثرات پر بحث کرتے ہوئے ایک کُل کی حیثیت سے علّامہ اقبال کا بھرپور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ (۱۹۷۷ء میں یہ کتاب تفہیمِ اقبال کی حقیقی ضرورت کے پیشِ نظر لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اقبال صدی کا ہنگامی دَور گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت

برقرار ہے۔ حال ہی میں اقبال اکادمی نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا ہے۔)

یک موضوعی مطالعوں کا نتیجہ ہے کہ جنابِ انور سدید کی بعد کی تصانیف میں نسبتاً زیادہ وقتِ نظر، ارتکازِ خیال اور تنقیدی گیرائی کا احساس ہوتا ہے۔ یوں تو ان کی جملہ تصانیف متعلقہ موضوعات پر اس حیثیت واہمیت کی حامل ہیں کہ انھیں نظر انداز کرنا خاصا مشکل ہے۔ تاہم "اُردو ادب کی تحریکیں" میرے خیال میں ایک وقیع تنقیدی وتحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے ایک بے حد پھیلے ہوئے اور مختلف الجہات موضوع (جو فی الحقیقت کئی موضوعات کا مجموعہ ہے) کو جس طور نہ صرف یہ کہ سمیٹا بلکہ گرفت میں لیا ہے، ہر انصاف پسند قاری اس کی داد دے گا۔ یقیناً یہ ایک حوالے کی چیز ہے۔

ایک ایسے دَور میں جب دُنیائے ادب میں بھی سارا زور شامیں اور جشن منانے اور منوانے، رونمائی کی تقاریب، برپا کرنے کرانے اور ادبی ایڈیشنوں میں انٹرویو اور تصاویر چھپوانے پر ہے، آپ کو (خصوصاً تنقید و تحقیق کے میدان میں جہاں قلم برداشتہ لکھ دینے کے برعکس کچھ "کاوش" کرنی پڑتی ہے) بہت کم ایسی چیزیں ملیں گی جنھیں آپ پڑھیں تو محسوس کریں کہ ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ کچھ حاصل ہوا ہے۔ اور یہ تحریر ہمیں دعوتِ غور و فکر بھی دیتی ہے۔ جنابِ انور سدید کی تحریریں اسی زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ بطور نقّاد اور بطور محقّق ان کا نام معتبر اور ان کا مقام و مرتبہ مسلّم ہے۔

نسیم سحر

ڈاکٹر انور سدید، لیڈر آف دی اپوزیشن

آج کل کوئی بھی پاکستانی اخبار اٹھایئے اس میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کا کوئی نہ کوئی گرماگرم بیان ضرور نظر آجائے گا، جس کا لب و لہجہ قائدِ حزبِ اختلاف کا سا ہوگا۔ اسی طرح پاکستان یا ہندوستان کا کوئی بھی ادبی رسالہ یا اخبار کا ادبی ایڈیشن دیکھئے تو اس میں ڈاکٹر انور سدید ضرور موجود ہوں گے۔ اگر انہوں نے خود کوئی موضوع نہیں چھیڑا ہوگا تو کسی نہ کسی ادبی مکتبِ فکر کے نمائندے نے انھیں ضرور موضوع بنایا ہوگا۔ وجہ؟ یہ کہ سرگودھا مکتبِ فکر کا وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ادبی دنیا میں ان کا کردار پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی طرح حزبِ مخالف کی ترجمانی کرتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر انور سدید نے "کھیڈاں گے نہ کھیڈن دیاں گے۔" کا نعرہ کبھی نہیں لگایا کیونکہ وہ سپورٹسمین سپرٹ کے مالک ہیں اور اس سپرٹ کا حسبِ ضرورت استعمال کر کے جب چاہیں مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کو منکچر آیوڈین تلاش کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا اصلی نام میاں انوار الدین ہے۔ ان کا تعلق ایک متوسط درجے کی راجپوت فیملی سے ہے لیکن ان کے والد بزرگوار کو احترام کے باعث میاں جی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ میاں کا لفظ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے سرگودھا میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ڈیرہ غازیخان کے گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا۔ وہیں کلاس لائبریری کے انچارج بنے اور مطالعہ کا ذوق پروان چڑھا۔ بزمِ ادب کے سیکرٹری بھی رہے۔ پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا مگر کچھ تحریکِ پاکستان کی مصروفیات اور کچھ ادبی مصروفیات اور کچھ ادبی سرشاری نے ایف ایس سی نہ کرنے دیا۔ پھر پچیس روپیہ ماہانہ سے محکمہ آبپاشی میں ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۸ء میں مستعفی ہو کر انجینئرنگ اسکول رسول گئے اور بی ایس سی انجینئرنگ کی ڈگری طلائی تمغے کے ساتھ حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں محکمہ آب پاشی میں ایس ڈی او ہو گئے۔ پھر ڈھاکہ

سے AMIE کا کورس کیا۔ ۷۰ء میں مہتمم انہار ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۸ء میں ساٹھ سال کی عمر میں ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس دوران اُردو میں ایم اے کیا اور دو طلائی تمغے اور بابائے اُردو ایوارڈ حاصل کیا۔ "اُردو ادب کی تحریکیں" کے موضوع پر مقالہ لکھا اور کئی سال کے بعد ۱۹۷۹ء میں اسی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کئی سال کا وقفہ اس لیے تھا کہ مخالفین ان کا مقالہ سرد خانے کی نذر کروانے میں کامیاب رہے تھے۔

انور سدید کو ادبی ذوق تو تھا ہی، ابتدا میں چند فلمی رسائل میں اس وقت کے مقبول رومانوی اسٹائل میں افسانے لکھے تو مصورِ جذبات کا خطاب پایا۔ ان دنوں وہ انور سدید میانوی کے نام سے لکھتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ میانہ روی سے کوئی تعلق تھا بلکہ اس لیے کہ پیدا میانی میں ہوئے تھے۔ ان دنوں وہ مصور تھے۔ اب قلمی کارٹونسٹ ہیں اور مخالفین کی بڑی مضحکہ خیز شکلیں بناتے ہیں۔ ادبی رنگ میں ان کے افسانے ہمایوں اور نیرنگِ خیال جیسے معتبر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر وزیر آغا نے "اوراق" جاری کیا تو انور سدید محقق اور نقاد کی صورت میں سامنے آئے اور آج تک ان کا قلم رُکا نہیں۔ اتنا لکھ چکے ہیں کہ اکثر لوگوں نے زندگی بھر میں اتنا پڑھا بھی نہیں ہوگا۔ افسانے، غزلیں، نظمیں، تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین، انشائیے، مزاحیہ شاعری، نثری طنز و مزاح، تدریسی کتابیں، ادبی وغیرادبی کالم، پنجابی میں شاعری، انگریزی میں ادبی و تنقیدی کالم، کتابوں پر تبصرے، سالانہ ادبی جائزے الغرض وہ کسی موضوع میں بند نہیں۔ انہیں "جیک آف آل ٹریڈز" کہنے کے بعد "ماسٹر آف ایوری تھنگ" بھی کہنا پڑتا ہے۔ ہر میدان میں یہ کسی فلمی ہیرو کی طرح اپنے مخالفین کے کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلمی مُردے تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا ہاتھ جسے پڑ جائے وہ مٹی چاٹتا رہتا ہے۔ کوئی سخت جان مخالف ہو تو ڈاکٹر انور سدید "زبان دراز سرگودھوی" کی کاسٹیوم پہن کر لفظوں کی کلاشنکوف لے کر بھی میدان میں کود پڑتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا سب سے بڑا اور توانا حوالہ ڈاکٹر وزیر آغا کی دوستی ہے جن کی خاطر انھیں "ہز ماسٹرز وائس" ہونے کا الزام بھی برداشت کرنا پڑا۔ دشمنوں کی توپوں کا رُخ ان کی طرف اس لیے بھی ہے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی مملکتِ ادب کے مضبوط ترین مورچے

کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردانہ وار لڑنے کے قائل ہیں کہ "جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی"
ان کی راجپوتی شان دفاع پر نہیں حملے پر یقین رکھتی ہے، لیکن یہ حملہ خالصتاً ادبی ہوتا ہے۔
ذاتیات پر اترنے والا نہیں۔ ان کی جنگ ادبی وڈیروں اور ادبی استحصال کے خلاف
ہے اور ان کی تحریر اتنی پُراثر ہے کہ کئی دشمن تو شعوری طور پہ کوشش کرتے ہیں کہ
ڈاکٹر انور سدید ان کے خلاف لکھیں تاکہ وہ بھی راتوں رات شہرت حاصل کر لیں۔
ان کے قلم کی کاٹ دیکھتے ہوئے کسی نے کہا تھا کہ ان کا نام اصل میں "انور شدید"
تھا اور کثرتِ استعمال سے ان کی "ش" کے نقطے گھس گئے ہیں۔ دراصل
انور سدید دریائے جہلم کے کنارے پر واقع قصبے "میانی" میں پیدا ہوتے تھے جہاں
قریب سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے۔ چنانچہ ان کی طبیعت میں جہاں دریا کی سی روانی
تازگی اور کشادہ ظرفی ہے، وہیں ریلوے انجن کی طرح سامنے آنے والی ہر شے کو
روند دینے کا جذبہ بھی ہے۔ تاہم ریلوے انجن ہی کی طرح وہ پٹڑی سے اترتے نہیں
ہیں ---- انجینئر ہونے کی وجہ سے ان کے ایک دوست صابر لودھی نے انہیں
"مستری بن کر ادب کی گاڑی مرمت کرنے والا" کہا ہے۔ لیکن انور سدید گاڑی کے ساتھ
ساتھ گاڑی چلانے والوں کے ڈھیلے نٹ بولٹ کسنے کے بھی ماہر ہیں۔ انجینئر کے طور
پر انھوں نے ہمیشہ نہروں کے پُشتے اور پائیدار پُل بنوائے، مگر ادبی دُنیا میں انہی کی
بدولت اتنی طغیانیاں اور سیلاب آئے کہ مخالفوں کے سب کاغذی پُل ٹوٹ گئے اور
تمام شکستہ کشتیاں غرقاب ہو گئیں۔ انور سدید زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتے اس لیے کچھ
اپنے بھی ان سے خفا رہتے ہیں لیکن انور سدید کی یہ شان بھی نرالی ہے کہ جہاں مخالفین ان
کے کیمپ کے کسی آدمی کی تخلیقات اپنے پرچوں میں شائع کرانا گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں، وہاں
انور سدید اپنے مخالفین کی تحریریں اپنے پرچوں میں اہتمام کے ساتھ شائع کر کے ثوابِ دارین
حاصل کرتے ہیں!

ڈاکٹر انور سدید جتنا زیادہ لکھتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ پڑھتے بھی ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ ان
کے آفس میں ادیب انور سدید کا داخلہ بند تھا، وہاں وہ صرف میاں انوار الدین ایگزیکٹو انجینئر
تھے۔ گھر میں وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے بھی بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے روز لکھنے پڑھنے کا کام
کرتے تھے۔ عموماً وہ صبح تین یا چار بجے بیدار ہو کر ٹھنڈے ٹھنڈے وقت گرما گرم تحریریں لکھتے

ہیں- ان کے اوقاتِ کار کی طوالت سے مخالفین کو اپنی اوقات یاد آجاتی ہے- بقول اکبر حمیدی "جانے وہ اتنا وقت لکھنے کے لیے کہاں سے لاتے ہیں- شاید ان کی گھڑی پر بارہ نہیں، چوبیس بجتے ہیں، بارہ تو ان کے بجتے ہیں جن پر انور سدید کا کالم چھپتا ہے-" ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ "انور سدید لکھتا تو بھرپور ہے لیکن اس کی تحریریں کڑی دھوپ ہوتی ہے-" اب تک مختلف ادبی موضوعات پر اور اصناف میں ان کی ۴۳ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور چھ کتابیں یا تو پریس میں ہیں یا کتابت کے مرحلے میں ہیں- تاہم یہ فہرست اس لحاظ سے پرانی ہو چکی ہے کہ یہ سب کارنامے ان کی ریٹائرمنٹ کے وقت تک کے ہیں- اب جبکہ وہ ساٹھ کے تو ہو چکے ہیں مگر سٹھیائے نہیں ہیں - ادبی کارنامے سرانجام دینے میں ان کی رفتار تیز تر ہونے کا شدید خطرہ ہے- ان کے بعد از ریٹائرمنٹ عزائم کا اندازہ اس سے لگائیں کہ انہوں نے ایک ادارے میں پرکشش تنخواہ پر نئی ملازمت کی پیش کش ٹھکرا دی ہے اور ہمہ وقت ادبی خدمت کا ارادہ رکھتے ہیں- ملازمت کے "کوئے یار" سے اب وہ کوئے دار چلے ہیں تو ان کے کئی مخالف تارا مسیح کی طرح اپنے اپنے پھندوں کی مضبوطی کا اندازہ لگا رہے ہیں- لیکن ڈاکٹر انور سدید ہمیشہ "قُولُوا قَوْلًا سَدِیْدًا" پر عمل پیرا ہیں اور ان پھندوں سے خائف نہیں ہیں- ان کے ہاتھ میں ایک توانا قلم ہے اور انہوں نے ادبی خدمت کی خاطر اپنی حق حلال کی جی پی فنڈ کی آمدنی سے پچاس ہزار روپیہ وقف کر کے "دائرۃ المصنّفین" کے نام سے ایک غیر تجارتی ادبی اشاعتی ادارہ قائم کیا ہے جس کے تحت "مُصنّفین" کے عنوان سے ایک ادبی ماہ نامہ نکالنے کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں- عمر بھر رشوت کا ایک پیسہ بھی نہ لینے والے اس شخص نے اتنے بڑے ادارے کی داغ بیل ڈال دی ہے مگر اپنے لیے کوئی کوٹھی یا بنگلہ بنوانے کی بجائے صرف پانچ مرلے کا ایک مکان تعمیر کروایا ہے- ادب ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے- شہرت اور نام و نمود سے یہ دور بھاگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "خوش قسمت لوگ وہ ہیں جو تخلیقِ ادب کو اپنی داخلی ضرورت تصور کرتے ہیں اور شہرت کے حصول کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرتے ـــــ اگر کبھی یہ فاحشہ تعاقب کرے تو خود اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں" ـــــ یہ فاحشہ ایک مدت سے ڈاکٹر انور سدید کا تعاقب کر رہی ہے اور ڈاکٹر انور سدید کی اچھی صحت کا ایک راز یہ بھی

ہے کہ تا حال اس فاحشہ سے جیت رہے ہیں، پکڑائی نہیں دیئے — بہر حال اگر کبھی پکڑے بھی گئے اور شہرت حاصل کر بھی گئے تو دامنِ یوسف کی طرح ان کا دامن بھی پیچھے سے چاک ہوگا جو ان کی معصومیت کا منہ بولتا ثبوت ہوگا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے "اوراق" کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر انور سدید کے لیے ستر صفحات پر مشتمل ایک خصوصی گوشہ ترتیب دے کر ان کی طویل ادبی خدمات، کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ گوشہ ان کی ہمہ گیر شخصیت، ان کے تبحرِ علمی اور ان کی بے مثال لگن کا محض ایک ہلکا سا خاکہ ہی پیش کر سکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آگے چل کر ان کے ہمہ جہت کام کا احاطہ کرنے کے لیے ان پر مبسوط کتابیں لکھنے کی ضرورت پڑے گی"۔ جب ڈاکٹر وزیر آغا "اوراق" کے ستر صفحات ڈاکٹر انور سدید کے لیے وقف کرنے کے باوجود عجز کا اظہار کرنے پر مجبور رہیں تو میں بھی ان چند صفحات پر مشتمل مضمون کے اختتام پر اظہارِ طمانیت نہیں کر سکتا اور تشنگی کا اعتراف کرتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں۔

اورنگ آباد کی ایک محفل

خیرالدین انصاری

انور سدید کی شاعری

گزشتہ چوتھائی صدی کے دوران میں جو نام اُردو ادب میں روشن ستارہ بن کر ابھرے ہیں ان میں سے ایک نام ڈاکٹر انور سدید کا بھی ہے۔ اس ستارے سے پھوٹنے والی روشنی نے اردگرد بکھری ہوئی تاریکیوں کو مار بھگایا ہے اور ادبی افق کو پہلے سے زیادہ روشن کر دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ایک کثیر الجہات انسان ہیں۔ یہ بیک وقت ایک نقاد، افسانہ نگار انشائیہ نگار اور خطوط نگار رہے ہے۔ اس نے غالب کے خطوط کی جس عمدگی سے پیروڈی کی ہے وہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کیونکہ غالب کے رنگ میں نامے کو مکالمہ بنانا طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ بارے کہ انور سدید اس مشکل کو آسان بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔

انور سدید کا بیک وقت اتنی اصنافِ ادب کو اپنانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس خیالات و تصوّرات کا ایک ایسا سمندر ہے جس کی لہریں اظہار کی کسی ایک صنف میں سما نہیں سکتیں۔ ع

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ڈاکٹر انور سدید بنیادی طور پر سائنس کا طالب علم تھا اور اس کا پیشہ غیر شاعرانہ رہا ہے لیکن اس کی طبیعت کو ادب سے فطری رغبت تھی جس نے اسے کسی کروٹ چین

نہ لینے دیا۔ اس کا خارج اس کے داخل کو شکست نہ دے سکا اور زندگی کے سفر کے دوران
میں جونہی موقعہ ملا اس کے اندر کا ادیب اور شاعر سر اٹھا کر منظرِ عام پر آگیا۔ اب ادب
ڈاکٹر انور سدید کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے بہت سا تنقیدی کام کیا ہے۔ اپنے ہم عصروں سے ادبی معرکہ
آرائیوں میں اپنے راجپوتی خون کی جولانیاں دکھائی ہیں اور اپنے حریفوں کو اکثر پیا دے کی
شہ دے کر مات دی ہے۔ اس کی جنگجویانہ فطرت نے ویسے تو اس کے نام کو بہت اچھا
ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس سے اس کے تخلیقی کام کو نقصان پہنچا ہے۔ یوں تو اس
نے ایک سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں جن میں انسانی فطرت کی اتنی گہرائی اور گیرائی تو ضرور
موجود ہے کہ اس کی یہ تحریریں صحافت کی سطح سے بلند ہو کر اعلیٰ درجے کے ادب پارو
میں شمار ہونے کے قابل بن سکی ہیں لیکن اس کے باوجود بطور افسانہ نگار اس کی شہرت گ
ہی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ برسوں سے اس نے کوئی افسانہ نہیں لکھا او
نئے قاری کو اس کا علم ہی نہیں کہ انور سدید کبھی معیاری افسانے بھی لکھا کرتا تھا — آج کا
قاری صرف اس کی انشائیہ نگاری کا معترف ہے۔ اور اس کی ان شگفتہ تحریروں پر جان
ہے۔ بلا شبہ اس نے اُردو ادب کو چند اچھے اور دوامیت کے حامل انشائیے دیئے ہیں
میں جذبات کی روانی، الفاظ کا ترنم، تخیل کے زور اور اسلوب کی دلکشی نے ان نثر پار
کو مرصع غزل کا ہمدوش بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی بسیار نویسی دیکھ کر مجھے تو یہ انسان کی بجائے کوئی جن لگتا ہے
لیکن میں اسے جن اس لیے نہیں کہتا کہ ایک تو سائنس کی رو سے جنوں، پریوں اور
کا وجود ثابت نہیں۔ دوسرے مذہبی نقطہ نظر سے انسان اپنی ساری کرداری کمزور
اور شخصی خامیوں کے باوجود اشرف المخلوقات ہے۔ اس لیے انسان کو جن یا فرشت
کہنا شرفِ انسانی کی توہین ہے۔ لیکن میں یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی اد
دفتری اور گھریلو مصروفیات کے درمیان غیر معمولی ہم آہنگی دیکھ کر یہ احساس بار
ستاتا رہتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اتنے سارے کام کرنا کسی اکیلے انسان کے بس کا روگ نہ
لہٰذا ممکن ہے کہ انور سدید نے کسی زبردست روحانی عمل سے جنوں کی پوری بستی کو اپنے قابو میں کر
ہو جو اس کے ہر حکم کی تعمیل میں سرِ مو تعجیل بھی گناہِ کبیرہ گردانتے ہوں۔ ڈاکٹر سدید جتنا لکھتا ہے میرے لیے تو ا
بھی ممکن نہیں ہے

انور سدید ایک صاحبِ طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ گو شاعر بھی ہے۔ اس کا شعری سرمایہ مختصر ہے تاہم اپنے معیار اور علوئے تخیل کی وجہ سے اس کا شعر خاصے کی چیز ہے۔ آخر مولانا محمد علی جوہر نے بھی تو چند ایک نظمیں اور غزلیں کہی تھیں لیکن ان میں مولانا جوہر نے جس خلوص، صداقت اور زورِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے اس نے قاری کے دل میں مولانا کو ایک ماہر سیاست دان، صاف گو مذہبی عالم اور صداقت شعار صحافی کی حیثیت کے ساتھ ساتھ بطور ایک شاعر کے بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ نثر کے میدان میں اتنا نام کما لیتے ہیں کہ ان کی شعری کاوشوں کی طرف لوگوں کی نظریں نہیں اٹھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی ایسے ہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح فکر تونسوی کا مجموعہ کلام اس کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے کبھی جعفر چکوری کے نام سے غزلیں لکھی تھیں۔ اب یہ نام کسی کو یاد نہیں ہے۔ اُردو ادب کے کئی بڑے ناقدین بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر خورشید الاسلام ان کی شعری کاوشوں کا اعتراف دبی زبان ہی سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا حال بھی ان سے مختلف نہیں ہے۔ تنقید میں اس کے قلم کی تیزی اور براقی نے وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ عام عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ اپنے تنقیدی مضامین میں قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے اس کے سامنے دلائل کے انبار لگا دیتا ہے جس سے اس کی ذات قاری کے اوسان پر چھا جاتی ہے۔ پھر جب یہ قاری کے دل و دماغ کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیتا ہے تو اچانک بیچ میں کوئی ایسا جملہ چھوڑ دیتا ہے جو آتش بازی کے گولے کے لیے فلیتے کا کام دیتا ہے اور قاری کے سابقہ نظریات کو بھک سے اڑا کر نئے خیالات کی قبولیت کے لیے خلا سا پیدا کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے بہت کم اشعار کہے ہیں لیکن اس کی غزلوں، نظموں، نعتوں اور حمدوں کا عقبی منظر اتنا وسیع اور جاذبِ توجہ ہے کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے یکایک کتنے ہی نئے جہانوں کے در وا ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے جب ادب کی وادی میں قدم رکھا تھا تو بہت سے ادیب اور شاعر شعر و ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ سیاسی فریضہ بھی سر انجام دیتے تھے۔ ملک میں آزادی کی تحریکوں کا اثر باقی تھا۔ حالی، اکبر الہ آبادی، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال کی شعری فتوحات کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی تو ایسے رندوں میں شامل تھے۔ ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنّفین بھی بڑے منظم طریقے سے اپنا کام کر رہی تھی اور ساحر لدھیانوی ایسے لوگوں کا طوطی بول رہا تھا۔ سید مطلبی فرید آبادی کے گیتوں کو لوگ بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ ایسے میں کسی ادیب کا سیاست سے اپنا دامن بچا لینا تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ سر پھرے ایسے بھی موجود تھے جو بالراست اندازِ بیان کے سخت مخالف تھے اور بات کو غلافوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کو شاعری کی معراج گردانتے تھے اس گروہ کے سرخیل میراجی تھے جو فرانسیسی شعرا ملارمے اور بودلیر کے تتبع میں ابہام کا شکار تھے لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا خوبصورت ضرور تھا کہ قاری اس سے ہرگز نظریں نہ چرا سکتا تھا۔ ویسے میراجی سیاست کو شجرِ ممنوعہ بھی نہ سمجھتے ہوں گے ورنہ وہ اس قسم کا شعر کیوں کہتے: ؎

دستِ مُزد میں خشتِ رنگیں یہ اشارہ کرتی ہے

صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک پیرٹ کا شعر ہے لیکن ہم اسے کمزور شعر بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس میں خیال مناسب و موزوں الفاظ سے اس طرح ہم آہنگ ہے کہ بات پُر تاثیر بن گئی ہے۔

دراصل ہم بعض اوقات سچی اور عوامی شاعری کی غلط ترجیحات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور کسی ایسے شعر کی داد دینے سے ہچکچاتے ہیں جو ہمارے نظریات کی تشفّی نہیں کرتا اور یوں سچّی اور عوامی شاعری کے چکر میں پڑ کر غلط قسم کے تعصّبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سچّی اور عوامی شاعری میں فاصلہ زیادہ دور کا نہیں۔ ان دونوں اقسام کی شاعری میں جو فرق ہے بس اتنا ہے کہ عوامی شاعر

کے ہاں ٹھوس حقائق اوپر کی سطح پر رہتے ہیں جب کہ ایک خالص اور پختہ گو شاعر کے ہاں سیاسی خیالات و واقعات اس طرح جزوِ شاعری بنتے ہیں کہ شعری حُسن تو اوپر رہتا ہے اور اس کے ذاتی خیالات و میلانات الفاظ کی زیریں سطح میں سیّال شے بن کر لہروں کی مانند ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں۔

انور سدید کا شمار اس نوع کے شعرا میں ہوتا ہے۔ یہ میراجی کے اسلوبِ شعر کو مانتا ہے اور مجید امجد کے قائم کردہ معیارات کو اپنا رہنما جانتا ہے۔ بلاشک یہ داخلیت پسند ہے لیکن خارج سے گریز اختیار نہیں کرتا۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اگر میراجی اور مجید امجد خارجیت سے نہیں بھاگ سکے تو انور سدید کیسے بچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں عصری تقاضوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ہاں سماجی مسائل بہ رنگِ دگر شعر کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کے ہاں سیاسی، اقتصادی ثقافتی اور معاشرتی مسائل کا اظہار کہیں واضح الفاظ میں اور کہیں اشاروں، کنایوں اور استعاروں کی مدد سے ہوتا ہے۔ اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے علامت کے استعمال پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ اس کے علامتی رنگ کے اشعار سہیلی بوجھ پہیلی قسم کی بات نہیں بنتے اور نہ ہی قاری کو اپنی جیب سے ان کے اندر مفہوم ڈالنا پڑتا ہے۔ بس ذہن پہ تھوڑا سا بوجھ ڈالنا پڑتا ہے۔ پھر شعر کے اندر کی پرتیں خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔ اس کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

ہر سمت سمندر ہے، ہر سمت رواں پانی
چھاگل ہے مری خالی، لوگو ہے کہاں پانی

اس شعر میں سمندر، پانی اور چھاگل اپنے لغوی مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے شاعر نے بڑی خوبصورتی اور خوبی سے شور مچائے بغیر عصرِ حاضر کے انسان کے تہذیبی کرب، روحانی اذیت، معاشرتی ناانصافی اور مادی ترقی کے ہوتے ہوئے لوگوں کی بنیادی ضروریات سے محرومی کو اچھے شاعرانہ اظہار سے نوازا ہے۔ اس غزل کے دوسرے اشعار بھی قاری کی خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

جس کھیت کو دہقاں سے مل جاتی تھی کچھ روزی
دریا کی طرح اس پر دیکھا ہے رواں پانی

بات جس کھیت سے دہقاں کو روزی نہ ملتی ہو اس کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دینے والی ہے لیکن انداز میں وہی مٹھاس اور شیرینی ہے جو کسی اچھے شعر کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہے۔

آگے چل کر پانی کو ایک نئی شکل عطا کی ہے اور انقلاب کے ذریعے بہتر زندگی تلاش کرنے پر اکسایا ہے۔

بہہ جاتی ہے ساتھ اس کے شہروں کی غلاظت بھی
جاروب کشِ عالم لگتا ہے رواں پانی

میں ڈاکٹر انور سدید کو دبستانِ سرگودھا کا نمایندہ شاعر سمجھ کر اس کے شعروں پر دھیان نہیں دیا کرتا تھا لیکن اب جب غور کیا تو مجھے اس کے شعروں کا رنگ ہی جداگانہ نظر آیا۔ یہ ترقی پسندوں کا ہم خیال نہ ہونے کے باوجود اپنی سوچ اور رویّے کے لحاظ سے غیر ترقی پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ہاں استحصالی طبقات کے حق میں کہیں بھی کلمۂ خیر نہیں ملتا۔ یہ زندگی میں ارتقا کے نظریے کی مخالفت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں یہ ظلم و جبر کے خلاف اپنی آواز بھی بلند کرتا ہے لیکن فن کی حدود میں رہ کر۔ "تاکہ شعر کا حُسن مجروح نہ ہو اور اس کی اثر یت زائل نہ ہو۔ قاری پر یہ چیزیں فوری طور پر اس لیے واضح نہیں ہوتیں کہ اس کے شعر میں بہت سے ابعاد (DIMENSIONS) ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار کو سمجھنے کے لیے پوری توجہ صرف کرنی پڑتی ہے تب جا کر ان کے الفاظ کی تہوں میں چھپے ہوئے جہانِ معنی کے رخ پر سے نقاب اٹھتی ہے اور قاری کی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی خوشنما منظر پھیل کر" "روح کو سکون اور ذہن کو جلا بخشتے" ہیں۔

ناقدینِ ادب کسی قادر الکلام شاعر کی جو تعریف کرتے چلے آتے ہیں میرے ایک دوست کو اس سے اتفاق نہیں اس کا اصرار ہے کہ کسی قادر الکلام شاعر کے لیے لازم ہے کہ وہ سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی اہلیت ثابت کرے۔ اس طرح تو میر انیس کا بھی قادر الکلام شاعر ہونا محل نظر ٹھہرتا ہے۔ جبکہ سبھی لوگ انہیں قادر الکلام شاعر مانتے چلے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو انور سدید قادر الکلام شاعر نہیں ہے لیکن اس کے پاس اپنے خیالات کو من و عن دوسروں تک پہنچانے کے لیے الفاظ کا اتنا ذخیرہ ضرور موجود ہے کہ وہ بلا تکلف اپنے دل

کی بات ہو بہو اپنے قاری تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ اپنے مطالب و مدعا کو حسین و جمیل الفاظ کے رنگین پیکر میں سجا کر قاری تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ کسی ایک صنفِ سخن پر آ کر ٹھہر نہیں گیا۔ اس نے غزل کے علاوہ نظم، حمد اور نعت کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ حمد و نعت میں اس نے روایت سے ہٹ کر اپنے جذبۂ ایمانی کا رنگ دکھایا ہے۔ اس کی مذہبی شاعری پڑھ کر ایمان کو طاقت اور رُوح کو تازگی ملی ہے۔

بیسویں صدی کے بے مثل اسلامی مفکرؒ نے جذبہ ایمانی کی صحیح ترین تفسیر چند الفاظ میں کر دکھائی ہے۔ کہتے ہیں: ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی

انور سدید نے اس شعر کو اپنا رہنما اصول بنا کر خدا تک رسولؐ کے واسطے سے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تصورات پر شرک کا معمولی سا سایہ بھی پڑنے نہیں پایا۔

حمد کے چند اشعار

وہ جو سرکارؐ ہے مدینے کی — اسی سرکارؐ کی حضوری دے
دردِ خارج سے حملہ آور ہے — کیف و مستی تو لاشعوری دے
ربِّ کعبہ مری گزارش ہے — مجھ کو دیدارِ آں حضوری دے

ایک اور حمد میں یہ جذبہ زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے

میرا سرمایہ مدحتِ احمد — رہنما فخرِ انبیا مولا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اگر خدا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ پیدا کرنا ہوتا تو وہ کبھی کائنات کو تخلیق نہ کرتا۔ آپ کی وساطت سے ہم تک جو پیغامِ خداوندی پہنچا ہے وہ قیامت تک ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ یہ پیغام ایک ایسی روشنی ہے جس کی ایک کرن کے سامنے دُنیا بھر کی تاریکیاں نہیں ٹھہر سکتیں۔ انور سدید نے اس حقیقت کو اپنی ایک نظم "مدینۃ النبیؐ" جو نعت کے رنگ میں کہی گئی ہے، نہایت بچے تلے الفاظ

میں بیان کر کے اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا ہے:

رحمت للعلمین محوِ تکلم جس میں تھے　　زندگی کا ایک مصدر ہے فضا اس شہر کی
اس سے خوشبوئے مکرم اُٹھ رہی ہے آج تک　　روحِ جسم و جان ہے خاکِ شفا اس شہر کی

اور یہ شعر اسلامی فلسفۂ حیات اور نظامِ زندگی کے مفہوم کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرتا ہے۔

روشنی اب تک زمانے کو عطا کرتی ہے یہ　　منبعِ انوار ہے ساری فضا اس شہر کی

ڈاکٹر انور سدید کوئی سخت مذہبی آدمی نہیں اور نہ ہی مذہبی شاعری کرتے رہنا اس کا مقصدِ حیات ہے۔ وہ ایک سچّا اور خالص ادیب اور شاعر ہے۔ شاعری کو وہ کسی مذہب کی باندی نہیں سمجھتا اور نہ ہی فن سے اس کی مراد اپنے نظریات کا پروپیگنڈا ہے وہ تو ایک حُسن کار ہے اور اظہار کے لیے خوبصورت پیرائے کو اپنانا ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری اس وقت جنم لیتی ہے جب شعری مواد شعری آہنگ سے مملو ہو۔ نیز شاعر کا ضمیر ہر قسم کے تعصّبات سے پاک ہو۔ ایسی باتوں کے لیے غزل کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ غزل اُردو زبان کی وہ صنفِ سخن ہے جس پر ماضی میں کئی بھاری دَور گزرے ہیں لیکن یہ ہر دَورِ ابتلا میں صعوبتیں جھیلتی ہوئی بھی کامران و کامگار ہو کر نکلی ہے اور ہر آزمائش کے بعد اس کے جسم و جان میں پہلے سے زیادہ حُسن اور توانائی آتی رہی ہے۔ اب بھی تقریباً سبھی قابلِ ذکر شاعر اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ لکھنی بھی آسان ہے۔ البتہ اسے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا سخت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی بہت کم ایسے شاعر موجود ہیں جنہیں صحیح معنوں میں جدید شاعر کہا جا سکے۔ بعض شاعر جدّت پسندی کو سمجھنے میں سخت قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ غزل میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کے دخل کو جدت پسندی کی معراج سمجھتے ہیں جب کہ جدید غزل میں نئی ڈکشن اور نئے تصوّرات کی موجودگی ازبس ضروری ہے اور اس کا رنگ اتنا نکھرا نکھرا ہونا چاہیئے کہ قاری کا دل گواہی دے کہ اس سے پہلے ایسی غزل کبھی نہ پڑھی تھی۔

انور سدید اس کارواں میں شامل ہے جس نے مجید امجد کی نظم اور شکیب جلالی کی غزل کے اسلوب کی روشنی سے نئی روشنی کو جنم دینے کی کوشش کی ہے۔ سچ یہ ہے

کہ شکیب جلالی کی غزل پڑھ کر اور اس پر تھوڑا بہت سر دُھن کر انسان کی سمجھ میں یہ بات خود بخود آجاتی ہے کہ جدید غزل کیا ہوتی ہے۔ انور سدید نے بھی اسی قسم کی غزل کہنے کی کوشش کی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اُردو زبان کے شاعروں کی فوج ظفر موج کی موجودگی میں اس کی غزل فکری اور فنی سطح پر اپنی الگ پہچان کرانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

پروفیسر حسن عسکری نے اپنی کتاب "ستارہ یا بادبان" میں ادبی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: "حقیقت میں ڈوب جانے کے لیے فن کاروں کو روزمرّہ کی حقیقت سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید نے اس بات کو یوں سمجھا ہے۔ آدمی جب تک دُنیا داری سے الگ نہ ہو۔ اچھا ادیب نہیں بن سکتا۔

پروفیسر حسن عسکری نے یہ بات آج کہی ہے اور ڈاکٹر انور سدید نے بھی اسی دور میں اس پر گرہ لگائی ہے۔ لیکن اگر ہم صدیوں پیچھے جھانکنے کی کوشش کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ہمارے بزرگ اس حقیقت سے غافل نہ تھے۔ مولانا رومؒ کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر جاں زنی یارے بود

آپ اپنی آسانی کے لیے ایک عالم، فن کار، ادیب، شاعر اور مصوّر کو ایک ہی طرح کا آدمی خیال کریں تو آپ کی نظر میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہے گا۔ جب ہم ان اصولوں کی روشنی میں انور سدید کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کسی قسم کی مایوسی نہیں ہوتی۔ یہ اپنے اشعار میں زندگی سے کٹا ہوا نظر آتا ہے جبکہ غور کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کے اشعار میں زندگی کے حقائق اپنی ٹھوس شکل میں موجود ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار بطور مثال پیش کرتا ہوں جن میں گلشنِ حیات میں چلنے والی مسموم ہواؤں کی پیدا کردہ افسردگی اور عصرِ حاضر کی روشنیوں میں جنم لینے والے ظلم کی تاریکیوں کا ذکر ہے۔

میز پر رکھے ہوئے اخبار کے اوراق میں   بج رہی ہے زور سے رشتوں کی ڈھولک دیکھ لے
موم کے پیکر سجے ہیں ریشمی ملبوس میں   ہاتھ لگتے ہی پگھل جائیں گے بیشک دیکھ لے

نظامِ سرمایہ داری میں جنم لینے والی فریب کاری اور سرکاری سطح پہ حکمرانوں کی بے حسی کا فن کارانہ انداز میں بیان کرنے کے لیے کیا اس سے اچھا پیرایہ لے آنا ممکن تھا۔ ان اشعار میں کہیں بھی بات کہنے کے لیے خطیبانہ رنگ اختیار نہیں کیا گیا۔ شاعر نے الفاظ کی خوبصورتی اور اپنی فنی پختگی کے بل بوتے پہ نئی ترکیبیں تراش کر ایک ایسا حسین لفظی پیکر تیار کر لیا ہے جو قاری کی حسیات کو جھنجوڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظروں کے سامنے فکر و نظر کے کئی روشن افق پھیلا دیتا ہے۔ انور سدید کا یہ سلیقہ اور اس کی ہنرکاری اسے اپنے ہم عصر شعرا میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

انور سدید کی علامتی رنگِ غزل میں کہی ہوئی ایک اور غزل ہے جس میں ہمارے سامنے کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن جب ہم ان الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں اور ہی قسم کا جہانِ معنی جلوہ ریز نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

پیوستہ جو زمیں سے شجر تھا وہ بچ گیا
آندھی اڑا کے لے گئی اونچے درخت کو

اس میں تصوّف کا رنگ آ گیا، سرکشی کے مقابلے میں عجز و انکسار کی بالادستی دکھائی گئی ہے۔ ویسے انور سدید کے ہاں درخت یا شجر کا لفظ اپنے اندر کئی علامتی مفہوم رکھتا ہے جو اپنی اپنی جگہ پہ مختلف قسم کی بہار دکھاتے ہیں۔ مثلاً

کتنے تھے سایہ دار شجر رہ گزر کے ساتھ
اب رہ گزر ترستی ہے اپنے درخت کو

پتّے نکل کے شاخِ برہنہ کی نوک سے
دیتے ہیں اک قبا نئی ننگے درخت کو

انور سدید مانگ دعا تو اٹھا کے ہاتھ
کاٹیں کبھی نہ وقت کے آرے درخت کو

ان اشعار میں درخت کا مفہوم بار بار بدلتا ہے۔ یہی علامت نگاری کا اعجاز ہے۔

بظاہر ان اشعار میں درخت کے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہاں کتنی ہی ایسی باتیں کہی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کے ماضی اور حال سے ہے۔ سایہ دار درخت، ترستی ہوئی رہ گزر، شاخِ برہنہ سے پھوٹنے والی کونپلوں کا درخت کو پتّوں کی نئی قبا دینا اور شاعر کا یہ دعا مانگنا کہ وقت کے آرے کبھی درخت کو نہ کاٹیں، ان کے عقب میں جہاں شاعر کا تصوّف سے لگاؤ جھلکتا ہے۔ وہاں اشاروں، کنایوں کی زبان میں وقت کی ریت پہ گزرتے چلے جانے والے قافلوں کا ذکر بھی آ گیا ہے جو اپنے پیچھے کتنی ہی انوکھی اور

دلچسپ داستانیں چھوڑ جاتے ہیں۔ یوں بھی لگتا ہے کہ یہاں انور سدید نے سماجی تقاضوں کو تخلیقِ شعر کے وہبی عمل سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس نے اپنی ظاہری آنکھ کو خارج کا مشاہدہ کرنے سے باز رکھا ہے لیکن اس کے اندر کی آنکھ اتنی سرکش ہے کہ اپنے فوکس میں وہ سارے منظر سمیٹ کر لے آئی ہے اور شاعر کو اپنی تخلیق کاری کی اساس غیر تراشیدہ جذبات پر رکھنے کی بجائے تہذیبی بلوغت کے عمل کو اپنانے پر مجبور کرتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم باہر کی آنکھ کو کتنا ہی بند رکھنے کی کوشش کریں ہمارا ذہن باہر کی طرف پھیلے ہوئے منظر سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انور سدید کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ سیاست سے بھاگتا ہے۔ پھر بھی اس کی نظر عالمی سیاست کی طرف اٹھ ہی جاتی ہے۔ اس کی ایک نظم "فلسطین کے لیے ایک نظم" کا حوالہ ضروری ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تیسری دُنیا کا کوئی بھی شاعر عالمی سیاسی حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ فرق صرف کسی شاعر کے ٹھوس حقائق سے نتائج اخذ کرنے کے بعد انہیں اپنی شاعری کا جزو بنانے کے عمل میں ہے۔ کچا اور جذباتی شاعر حقائق کو سطح کے اوپر ہی اوپر رہنے دیتا ہے جب کہ ایک خالص اور سچا شاعر اپنی مشّاقی کے زور پر ان باتوں کے لیے ایسا پیرایہ اظہار اختیار کرتا ہے کہ اس کے وہ ذاتی خیالات و میلانات کسی سیّال شے کی مانند زیریں لہروں تک چلے جاتے ہیں جنھیں شعریت اپنے خول میں بند کر لیتی ہے۔

انور سدید کی ایک نظم "زمین" بھی اسی نوع کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جس میں بظاہر کوئی سیاسی ٹچ نہیں ہے لیکن اس کا تعلق عام انسانوں کے سیاسی مذہبی، ثقافتی اور تہذیبی رویّوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے اس کی نگاہ آسمان کی طرف نہیں اٹھتی بلکہ ٹکٹکی لگائے زمین کی طرف دیکھتا رہتا ہے جس کا دامن آغوشِ مادر کی طرح راحت افزا اور سکون بخش ہے۔ اس مختصر سی نظم میں بہت سی سچائیاں آگئی ہیں۔ اس کی ہر سطر کی قرأت کے بعد قاری کو تھوڑی دیر کے لیے رک کر سوچنا پڑتا ہے۔ تب پہلی سطر کا آگے آنے والی سطر سے رابطہ برقرار رہتا ہے۔ اور یوں قاری کی آنکھ ان مثبت قدروں، رنگینیوں اور خوشبوؤں

کا احساس کرسکتی ہے جو اس نظم میں فن کی شال اوڑھے سو رہی ہیں۔ مشک آنست کہ خود ببوید کے تحت پوری نظم نقل کی جاتی ہے تاکہ آپ خود ہی اندازہ کرسکیں کہ اس نظم کی سطور میں معانی کی کتنی تہیں موجود ہیں اور یہ ایک نظر کتنے منظروں پر محیط ہے:

زمین

زمیں جو لمحوں کی ٹوٹی مالا کے گرتے موتی نگل رہی ہے
اسی زمیں سے حیات پھوٹی
اسی زمین کا خمیر سیّال خون بن کر
مری رگوں میں بہا تو میں نے
عظیم ترکل کا بھید سمجھا
عظیم ترکل کا راز پایا

زمین رازوں کا ایک معبد
زمیں شراروں کا ایک مدفن
میں اس کی بانہوں میں ایک بالک
وہ میری آنکھوں میں اک ستارہ
زمیں مری زندگی کا منبع
زمیں مری آرزو کا ماخذ
زمیں جو سورج اگل رہی ہے

ایک یورپی مصنف نارتھ روپ فرائی نے ایک جگہ بڑی عمدہ بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی شاعر کے بارے میں یہ فیصلہ دینا کہ وہ کیسا شاعر ہے قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس فیصلے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کیا وہ سچا شاعر بھی ہے۔

آج کے نقاد کو انور سدید کے بارے میں یہی فیصلہ دینا ہے۔

ڈاکٹر بشیر سیفی

اُردو ادب کی تحریکیں

"اُردو ادب کی تحریکیں" ڈاکٹر انور سدید کی وہ کتاب ہے جو شائع ہوتے ہی حوالہ بن گئی۔ یہ کتاب اگرچہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے مگر چونکہ ڈاکٹر انور سدید نے بہت سے دیگر مقالہ نگاروں کی طرح ایم۔ اے سے فارغ ہونے کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ کر تنقید و تحقیق کی مبادیات سے آشنائی حاصل نہیں کی بلکہ متعدد تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھنے اور تنقید و تحقیق کا وسیع تجربہ حاصل کرنے کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے کا آغاز کیا۔ اس لیے یہ مقالہ محض پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ نہیں بلکہ اپنے موضوع پر انتہائی مبسوط اور فکر انگیز تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے اُردو ادب کی تمام تحریکوں سے مکمل آگاہی ہوتی ہے۔

پہلا "باب تحریک اور اس کے عوامل" کے عنوان سے ہے جس میں تحریک کی ماہیت اور معنویت بیان کرنے کے علاوہ تحریک کے آغاز اور عروج و زوال کا سائنٹفک تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز ادب میں نئے سوال اور نئے رجحان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے سیاسی تحریک اور ادبی تحریک کا فرق اجاگر کیا گیا ہے۔ تہذیبی ترقی کی روشنی میں دُنیا کی قدیم تحریکوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قرونِ وسطیٰ کی مذہبی تحریکوں اور مغرب میں احیاء العلوم کی تحریکوں کا احاطہ کرنے کے بعد مغرب میں ادب کی کلاسیکی اور رومانی تحریکوں کے علاوہ وجودیت، نفسیات، آزاد تلازمہ خیال، تمثیلی، تجریدی، علامتی، تاثراتی اور مارکسی تحریکوں کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے اور ان تحریکوں کے

آغاز وارتقا میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ادیبوں اور ان کے ادب پاروں کا تذکرہ بھی ہے۔ مقالے کا یہ باب وہ کلید ہے جس سے عالمی سطح کی مذہبی اور ادبی تحریکوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے اثرات کسی ایک مقام یا کسی خاص زمانے کے ساتھ ہی متعلق ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ یہ ہر زمانے میں مناسب حالات اور ماحول کی تلاش میں رہتے ہیں اور مکانی اعتبار سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے باب کا موضوع اگرچہ "ریختہ کی دو تحریکیں" ہیں یعنی امیر خسرو اور ولی دکنی کے اُردو شاعری پر اثرات کا مطالعہ مگر اس باب میں برِصغیر کی قدیم تحریکوں کے پس منظر کے ساتھ ساتھ بھگتی تحریک اور صوفیا کی تحریک پر بھی تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ بقول مصنّف ان دونوں تحریکوں نے بھی اُردو زبان و ادب کو متاثر کیا اس طرح اس باب میں ولی کے دَور تک ہندوستان کی تہذیبی اور مذہبی روایات کی تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔

تیسرے باب کا موضوع "اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی لسانی تحریکیں" ہیں۔ اس باب میں اوّلاً فارسی اور مقامی زبانوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی لسانی تحریکوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور ثانیاً اُردو شاعری میں ایہام کی تحریک اور سیاسی سماجی پس منظر میں اصلاحِ زبان کی میکانکی کوششوں پر ردِّ عمل کو اجاگر کرتے ہوئے ان تحریکوں کے اہم اور نمائندہ شعرا کے فکر و فن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

فورٹ ولیم کالج نے اُردو نثر کی ترویج و ترقی میں بالواسطہ جو اہم کردار ادا کیا اس کا تذکرہ چوتھے باب میں کیا گیا ہے۔ یہ باب اُردو نثر کے آغاز سے فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے مثبت اور منفی اثرات کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ اس طرح اس تحریک کے ادبی اور سیاسی دونوں زاویے اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

پانچواں باب علی گڑھ تحریک کے اثرات و ثمرات سے بحث کرتا ہے۔ اس باب میں انیسویں صدی کے سیاسی تحرک اور اس عہد کی اہم مذہبی تحریکوں یعنی برہمو سماج، سیّد احمد بریلوی شہید اور سیّد احمد خاں کی تحریک کا جائزہ پیش کرتے ہوئے سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز علی گڑھ تحریک کے سیاسی اور مذہبی زاویوں پر بحث کرتے ہوئے سر سیّد تحریک کے ردِّ عمل کے طور پر اُبھرنے والی دیگر تحریکوں کا

احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ باب بھی اس دور کی ادبی تحریکوں کے علاوہ تہذیبی، مذہبی اور سیاسی تحریکوں کی تاریخ پر محیط ہے۔

چھٹا باب انجمن پنجاب کی تحریک کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں انجمنِ پنجاب کے قیام، انجمن کے اغراض و مقاصد اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے محمد حسین آزاد کی عطا کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا ہے کہ آزاد ہی نے اوّل اوّل غزل کے مقابلے میں نظم کی ترویج کی کوششیں کیں۔ اس باب کے دوسرے حصّے میں "انجمن کا تنقیدی زاویہ" کے عنوان سے انجمن پنجاب کی اس جہت کو پیش کیا گیا ہے جس کی طرف عام طور پر زیادہ توجّہ نہیں دی جاتی۔ بقول مقالہ نگار "حالی کا تنقیدی شعور بھی انجمنِ پنجاب ہی کی عطا ہے اور چونکہ اُردو تنقید کے اوّلیں باضابطہ نقّادوں آزاد اور حالی کی مزاج سازی میں انجمنِ پنجاب نے اہم کردار ادا کیا اس لیے آج تنقید و تحقیق کے میدان میں جو روشنی نظر آرہی ہے اس کا ایک ماخذ انجمنِ پنجاب بھی ہے چنانچہ مستقبل میں تنقید و تحقیق کے جو زاویے وحید الدین سلیم، امداد امام اثر اور مہدی افادی جیسے نقّادوں نے روشن کیے ان میں حالی کا معنوی استدلال اور آزاد کا تخلیقی اسلوب بخوبی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ چونکہ اورنٹیل کالج لاہور انجمنِ پنجاب کی تحریک پر قائم ہونے والے مدرستہ العلومِ مشرقی کی ارتقائی صورت ہے اس لیے مصنّف نے اورنٹیل کالج میں پروان چڑھنے والی تنقیدی اور تحقیقی روایت کو انجمنِ پنجاب سے منسلک کرتے ہوئے "انجمن پنجاب" تحریک کو ایک جامع، ہمہ جہت اور مکمل ادبی تحریک کہا ہے کیونکہ اس تحریک نے نظم و نثر دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔

ساتواں باب اقبال کی تحریک کے جائزے کے لیے مختص ہے۔ بلاشبہ اقبال ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے اُردو شعر و ادب پر جو فکری اور اسلوبیاتی اثرات مرتسم کیے ان کے پیشِ نظر اقبال کے فکر و فن کو بطورِ تحریک موضوع بنانا درست ہے مگر جن لوگوں نے اقبال کے فکر و فن کی براہِ راست خوشہ چینی کی ان کا تفصیلی تذکرہ بھی اس باب کا موضوع تھا جس کی طرف مصنّف نے محض سرسری اشارے کیے ہیں۔ اگر اس باب میں ابنِ حزیں اور اس طرح کے دیگر شعرا کا بالتفصیل ذکر کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

علی گڑھ تحریک کی منطقیت اور عقلیت کے ردِّ عمل میں معرضِ وجود میں آنے والی

رومانی تحریک نے خیال اور اسلوب میں جو انقلاب آفریں تبدیلیاں پیدا کیں ان کا جائزہ مقالے کے آٹھویں باب کا موضوع ہے۔ اس باب میں رومانی تحریک کے اہم نثر نگاروں اور شعرا کی انفرادی خصوصیات کو اُردو کی رومانی تحریک کے اجتماعی تاثر کے پس منظر میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے کہ رومانی تحریک کے عروج و زوال کے نقوش از خود روشن ہو جاتے ہیں۔

اُردو ادب میں مقصدیت کی پہلی آواز اگرچہ سر سید احمد خاں نے بلند کی مگر باضابطہ اور منظم طور پر ادب میں انفرادیت کے بجائے اجتماعیت اور افادیت کا نعرہ ترقی پسند تحریک نے لگایا اور ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات میں بہت جلد مقبول بھی ہو گئی۔ اس نیم ادبی اور نیم سیاسی تحریک کے عروج و زوال کی داستان نویں باب کا موضوع ہے۔ مقالہ نگار نے غالباً پہلی بار ترقی پسند تحریک کے سیاسی زاویوں پر کھُل کر لکھا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کا سیاسی زاویہ ابھارنے کے ساتھ ساتھ تحریک کی ادبی عطا کا بھی برملا اعتراف کیا ہے۔

دسویں باب میں حلقہ اربابِ ذوق کی تفصیلی تاریخ بیان ہوتی ہے مگر حلقہ کی تنظیمی تاریخ میں صرف لاہور کو اہمیت دی گئی ہے۔ حالانکہ حلقہ صرف لاہور تک محدود نہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق کی شاخیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حلقہ کی ادبی اور سیاسی تقسیم صرف لاہور تک محدود تھی۔ دیگر شہروں میں موجود حلقہ کی شاخوں نے تو اس تقسیم کے ردِ عمل میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے لاہور سے اپنا رابطہ ہی منقطع کر لیا تھا۔ تخلیقی حوالے سے بھی صرف لاہور کے ادبا و شعرا کو قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے۔ جبکہ بطور تحریک دیگر شہروں کے اہم ادبا و شعرا کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔

گیارھواں باب اسلامی ادب کی تحریک کے آغاز و ارتقا اور اس تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب کے جائزے پر مشتمل ہے۔

بارھویں باب کا عنوان اگرچہ "پاکستان میں ادب کی دو تحریکیں" ہے اور اسے پاکستانی ادب کی تحریک اور ارضی ثقافتی تحریک کے ذیلی عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مگر حقیقتاً یہ باب ارضی ثقافتی تحریک ہی سے بحث کرتا ہے کیونکہ پاکستانی ادب کی تحریک اسلامی ادب کی تحریک ہی کا ایک زاویہ ہے غالباً اسی لیے فاضل مقالہ نگار نے پاکستانی ادب کی تحریک کا ذکر محض ایک صفحہ میں سمیٹ لیا ہے۔ ارضی ثقافتی تحریک کا تذکرہ بھی تشنہ ہے شاید اسی لیے کہ ابھی یہ تحریک اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے اور شعوری طور پر اسے اپنانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

"اُردو ادب کی تحریکیں" کے مختلف ابواب کا مختصر تعارف اور تجزیہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس کتاب کا موضوع خاصا وسیع ہے اور ڈاکٹر انور سدید نے اس مقالے میں وہ تمام علم سمو دیا ہے جس سے ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ چونکہ ادب تاریخ، سیاست و ثقافت اور سماج کے اثرات سے آزاد نہیں ہوتا بلکہ ان سے اثر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں متاثر بھی کرتا ہے اس لیے اس کتاب میں اُردو ادب کی تحریکوں کا مطالعہ وسیع تر تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ضمناً اس کتاب میں برِصغیر کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ بھی مرتب ہو گئی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی اس کا تخلیقی اسلوب ہے۔ یہ کتاب تنقید و تحقیق کی عام کتابوں کی طرح خشک منطقی اسلوب کے بجائے شگفتہ تخلیقی اسلوب کی حامل ہے بعض لوگ اس قسم کے اسلوب کو تنقید و تحقیق کے لیے موزوں نہیں سمجھتے، مگر میری ذاتی رائے میں تخلیقی اسلوب تنقیدی و تحقیقی مضامین کی موضوعیت کو متاثر نہیں کرتا۔ تاہم ان کی تنقید کو محض جمالیاتی تنقید نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کی تنقید میں صرف لطافت ہی نہیں معنویت اور گہرائی بھی ہے۔

مختصراً اس ایک کتاب کے مطالعے سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو بعض اوقات کئی کتابوں کے مطالعے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر سید احسن زیدی

انشائیہ اُردو ادب میں

ڈاکٹر انور سدید کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ محقق ہیں۔ افسانہ نویس ہیں۔ انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے تنقیدی شعور نے اُردو ادب میں خوبصورت اضافے کیے ہیں اور شاعری کا میدان بھی ان کے لیے اجنبی نہیں ہے، جس طرح بہت سی آوازیں مل کر ایک دلآویز آرکسٹرا کا رُوپ دھار لیتی ہیں اسی طرح انور سدید کے یہ سب پہلو مجتمع ہو کر ان کی شخصیت کے گرد ایک خوش رنگ ہالہ بُن دیتے ہیں اور ان کے قریب آنے والا شخص نہ صرف اس رنگا رنگی کی کشش کا زندانی ہو جاتا ہے بلکہ اسے ہر رنگ جنّت نگاہ اور ہر آواز فردوس گوش محسوس ہوتی ہے۔

انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس نے حال ہی میں مقبولیت کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ صنفِ اظہار انور سدید کی مرغوب اور پسندیدہ صنف ہے۔ ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ "ذکر اس پری وش کا" قارئینِ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے نہ صرف عمدہ انشائیے تخلیق کیے ہیں بلکہ وہ انشائیے کے مزاج شناس بھی ہیں اور اس کی پوری تاریخ پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "انشائیہ اُردو ادب میں" فن انشائیہ نگاری پر ان کی مضبوط گرفت کا اظہار ہے۔ انھوں نے ایک ماہرِ فن کی طرح اس صنفِ ادب میں مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

اور گزشتہ چند سالوں میں انشائیہ کے بارے میں جو اختلاف رائے معرضِ اظہار میں آیا ہے اس پر مدلل بحث بھی کی ہے۔

"انشائیہ اُردو ادب میں" نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب انشائیہ کے فنّی لوازمات اور اس کی تعریف سے متعلق ہے۔ انشائیہ ایک درآمد شدہ صنفِ ادب ہے۔ ناول اور مختصر افسانے کی طرح یہ بھی یورپی ادب کی شاخ ہے۔ اس لیے اس باب میں انور سدید نے تمام ممکنہ یورپی حوالے پیشِ نظر رکھے ہیں لیکن وہ بات کر رہے ہیں اُردو انشائیہ کے پس منظر کی۔ اس لیے ان کا رخشِ قلم یہاں پر رک نہیں گیا۔ بلکہ انھوں نے اُردو انشائیے کے ممتاز نقّادوں احمد جمال پاشا اختر اورینوی، نیاز فتح پوری۔ ڈاکٹر سیّد محمد حسنین، سیّد احتشام حسین، ڈاکٹر وزیر آغا نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کی آرا کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اُردو میں انشائیہ کو ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے، اس کی فنّی بوطیقا مرتّب کرنے اور اسے اہلِ قلم کی توجہ کا مرکز بنانے میں سب سے اہم کردار ڈاکٹر وزیر آغا کا ہے جن کا شگفتہ، لطیف اور بے تکلّف اندازِ تحریر اس نووارد صنف کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دوسرے باب میں انشائیہ کی یورپی روایت کا ذکر کرتے ہوئے انور سدید نے اپنے وسیع اور عمیق مطالعہ کا واضح ثبوت فراہم کیا ہے۔ انھوں نے فرانسیسی ادیب مونتین سے لے کر دورِ جدید کے مصنّف ایلیافاتک انشائیہ کے ارتقائی مراحل پر بڑی مفصل گفتگو کی ہے اور اُردو ادب کے قاری پر انشائی روایت کے بوقلموں دریچے کھولے ہیں۔

تیسرے باب میں اُردو ادب کے ابتدائی دَور سے سرسیّد تک انشائیے کے نقوش تلاش کرنے کی سعیٔ مشکور کی گئی ہے۔ چوتھا باب عہدِ سرسیّد کی انشانگاری پر مشتمل ہے جس میں محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، عبدالحلیم شرر اور وحیدالدین سلیم کی تحریروں میں انشائیے کے منتشر نقوش کی مبہم صورتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ بیسویں صدی میں انشائیے کی پیش قدمی پانچویں باب کا موضوع ہے۔ اس میں آغا شاعر قزلباش سے لے کر

علی اکبر قاصد تک کے عہد تک کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

چھٹا باب انشائیہ کے عبوری دور سے متعلق ہے جس میں نصیر آغا (وزیر آغا کا ابتدائی قلمی نام) داؤد رہبر، جاوید صدیقی، غلام علی چودھری، ممتاز مفتی اور امجد حسین اُردو انشائیے کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر رہے تھے۔

دورِ حاضر انشائیہ کا عہدِ زرّیں ہے۔ جس میں وزیر آغا سے لے کر سلیم آغا قزلباش تک انشائیہ نگاروں کی ایسی کہکشاں دکھائی دیتی ہے جس نے مطلعِ ادب کو اپنی تابانی سے روشن کر رکھا ہے۔ اس دور میں وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، مشتاق قمر، جمیل آذر، نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد اور رام لعل نابھوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں

ساتواں باب اسی دور کے تاریخی سفر کی روداد ہے ۔ آٹھویں باب میں ان انشائیہ نگاروں کا تذکرہ ہے جو آفتاب سرِ کوہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنی افتادِ طبع سے عمدہ انشائیے تخلیق کئے۔ مگر زندگی کی بھول بھلیوں میں ایسے گم ہوئے کہ یا تو ادب سے کنارا کش ہو گئے یا دیگر اصنافِ ادب کی دل کشی میں کھو گئے ان انشائیہ نگاروں کو انور سدید نے گم شدہ انشائیہ نگاروں کے نام سے یاد کیا ہے۔

بقول ان کے "اُردو انشائیہ کے یہ ستارے اگرچہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ان کی تخلیقات ہمیں اب بھی اس بے نام مسرت سے آشنا کر رہی ہیں جو ان کے انشائیوں میں موجود ہے۔"

چنانچہ یہ انشائیہ نگار انشائیہ کے دورِ زرّیں ہی کا جزو قرار پاتے ہیں، ایسے انشائیہ نگاروں میں انور سدید نے محمد ہاشم، جاوید انور، عاصی کرنالی، پرویز عالم وغیرہ کے نام گنوائے ہیں۔

آخری باب ان انشائیہ نگاروں کے نام ہے جن سے زمانۂ آیندہ میں بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ان میں طارق جامی، محمد اسد اللہ، اکبر حمیدی، بشیر سیفی اور سلمان بٹ شامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں حاصلِ مطالعہ کے عنوان سے انور سدید نے اپنی ساری بحث کو خوبصورتی سے سمیٹا ہے۔ اگر کوئی قاری ساری کتاب نہ پڑھ سکتا ہو تو ان چند صفحات میں اسے انشائیہ کے بارے میں اس قدر مربوط مواد مل جاتا

ہے کہ وہ انشائیہ کی پوری تاریخ سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

اُردو ادب میں بے شمار جلیل القدر نقّاد وجود میں آچکے ہیں اور ان کے حوالے سے بہت سے دبستانِ تنقید بھی معرضِ وجود میں آچکے ہیں لیکن ان نقّادوں نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے مضامین تک محدود رکھا ہے۔ یک موضوعی کتابیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں۔ انور سدید نے کچھ عرصہ ہوا "وزیر آغا۔ایک مطالعہ" کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے کر وزیر آغا کی شخصیت اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ "انشائیہ اُردو ادب میں" ان کی دوسری یک موضوعی تصنیف ہے۔ اس قسم کی کتابیں تخلیق کرنے کے لیے جس جاں سوزی اور عرق ریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس سے آج کا قلم کار کترا کے گزر جاتا ہے۔ لیکن مطالعہ کا شوق فراواں اور تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کی ضوریزیوں نے انور سدید کو کبھی تھکنے نہیں دیا۔ اسی لیے محاذِ ادب پر ان کی معرکہ آرائیاں خاص و عام کا دلپذیر موضوع بن چکی ہیں۔ انھوں نے کبھی قلم برداشتہ نہیں لکھا اور لکھتے ہوئے کبھی معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ وہ موضوع پر پوری تحقیق کے بعد لکھتے ہیں۔ بقول وزیر آغا:

"وہ ایک با اصول اور زیرک ایڈووکیٹ کی طرح باقاعدہ اپنا ادبی کیس تیار کرتے ہیں اور پھر اپنے قلم کے سارے زور اور منطق کی پوری قوت کے ساتھ اسے بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔"

انور سدید کا اسلوب ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ شائستہ اور مہذّب لیکن جہاں کہیں مخالفین اپنی غلط بات پر اڑ جائیں تو جارحانہ انداز بھی ان سے غیر متوقع نہیں ہے۔

"انشائیہ اُردو ادب میں" اپنے موضوع پر پہلی سنجیدہ اور ذمہ دارانہ کاوش ہے اور دورِ آئندہ میں یہ کتاب اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے کتابِ حوالہ ثابت ہو گی۔

ڈاکٹر حسن اختر

اقبال کے کلاسیکی نقوش

ڈاکٹر انور سدید نامور محقّق اور نقّاد ہیں اور انھوں نے اُردو ادب کی مختلف اصناف میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ وہ اتنا زیادہ لکھتے ہیں کہ میں حیران ہوتا ہوں کہ ان کے پاس اتنا وقت، کہاں سے آتا ہے۔ دراصل وہ وقت کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ وہ شاعری کرتے ہیں، افسانے لکھتے ہیں۔ کالم نگار ہیں۔ تحقیق کے میدان میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ تنقید کی وادی ان کے زیرِ نگیں ہے۔ وہ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی قلم کاری کرتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی دلچسپیاں گوناں گوں ہیں۔ وہ لوگوں سے ملتے ہیں۔ ادبی محفلوں کی رونق بڑھاتے ہیں اور اس کے علاوہ ادب کے میدانِ جنگ میں اتنی پھرتی اور تیزی سے تلوار چلاتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ اس وقت ہم انور سدید کا خاکہ لکھنے کے بجائے ان کی کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

علاّمہ اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہر روز کچھ نہ کچھ لکھا جا رہا ہے۔ جہاں اتنی افراط ہو وہاں معیار میں کمی آ جاتی ہے۔ مگر یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اقبال پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ غیر معیاری اور بیکار ہے۔ اقبالیات کے ڈھیروں میں جہاں کوڑا کرکٹ ہے وہاں انمول ہیرے بھی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی زیرِ نظر مختصر کتاب بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اور ان کے وسیع

مطالعہ اور وسعتِ نظر کی آئینہ دار ہے۔

"اِقبال کے کلاسیکی نقوش" میں ڈاکٹر صاحب کے پانچ مضامین شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱- اقبال کی تحریک ۲- اقبال، مخزن اور رومانیت ۳- اقبال کے کلاسیکی نقوش ۴- اقبال کے عبوری دَور کی غزل ۵- اقبال کا تصوّرِ حیات و مرگ۔

ان میں تیسرے مضمون کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ 'اقبال کی تحریک' پہلا مضمون ہے اور سب سے طویل ہے اس کے بعد بتدریج مضامین کی طوالت کم ہوتی جاتی ہے چنانچہ "اقبال کا تصوّرِ حیات و مرگ" سب سے مختصر مضمون ہے۔

'اقبال کی تحریک' میں ڈاکٹر انور سدید نے علامہ اقبال کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا ہے اور اقبال کی شاعری کی تحریک کے محرکات کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں باقی مضامین کے اشارات مل جاتے ہیں انہوں نے ایک مضمون 'اقبال کے عبوری دَور کی غزل' پر بھی لکھا ہے۔ اقبال کی روایت میں بھی غزل کے بارے میں اظہارِ خیال ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال کی غزل طرزِ احساس، اندازِ فکر اور داخلی توانائی کی بدولت قدیم غزل سے ایک مختلف چیز ہے لیکن اسے غزل نہ کہنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا کہ غزل کے اجزائے ترکیبی مثلاً ریزہ خیالی، عمومیت، ردیف اور قافیہ کی پابندی انفرادی تجربہ کے بجائے اجتماعی تجربے کی پیش کش وغیرہ سب اس میں موجود ہیں۔"

اب ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے اس میں دوسرے اور تیسرے مضمون کی طرف اشارات موجود ہیں:

"اقبال نے جس ادب کے فروغ کی تحریک کی اس نے نہ صرف فرد کے ہمہ جہت جذبات کی تسکین کی بلکہ یہ قوم کی اجتماعی زندگی کی تعبیر بن گیا۔ نتیجتاً یہ کہنا درست ہے کہ کلاسیکی ٹھہراؤ کے باوجود اقبال تحریک کی جہت مستقبل کی طرف تھی اور اس میں حرکت، حرارت اور توانائی کا عنصر موجود تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ اقبال کی تحریک نے اپنے دورِ عمل میں صرف تحرّک کی کیفیت پیدا کی ------ اور عقاید کی اندھا دھند تقلید کے بجائے انھیں عقل و شعور کی کسوٹی پر پرکھنے کی راہ سجھائی۔"

مگر اس سے مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی مضامین تکرار ہیں بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مضمون اقبال کا مجموعی تاثر مہیّا کرتا ہے۔ اس کے اشارات کی تفصیل آیندہ مضامین میں ملتی ہے لیکن یہ مضمون اپنے اندر ایک خاص موضوع بھی رکھتا ہے اور وہ اقبال کی تحریک اور اس کے بنیادی عناصر ہیں اور ان کو ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ہمارے نقّاد جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کی محبت انھیں اسیر کر لیتی ہے اور پھر آنکھیں بند کر کے اسی کے ہو جاتے ہیں، مگر ڈاکٹر انور سدید توازن کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کی تحریک کو صرف شاعری کی تحریک کہا ہے۔ اور لکھا ہے کہ نثر کی ترویج میں اقبال کی نثر نے کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے شاعری کے لیے زبان کا جو اسلوب اختیار کیا تھا وہی اسلوب اُردو نثر کے لیے بھی استعمال کیا۔ شاعری میں انھوں نے طغیانِ افکار کو وجدانی قوّت سے سمیٹنے کی سعی کی۔ چنانچہ ان کی منفرد زبان نہ صرف ان کی فکر کا پورا احاطہ کرتی ہے بلکہ اس کے زیرِ سطح حرکت و عمل کی ایک رو بھی موجزن ہے۔ یہ زبان نہ صرف تحرّک کی عکاسی کرتی ہے بلکہ تحرّک کی رو کو قاری کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ اقبال کا یہ اسلوب بلاشبہ ان کی شخصیت سے ہی پھوٹتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسی کو نثر میں استعمال کرنے کی کوشش بھی کی تاہم شاعری اور نثر کے فطری تقاضے چونکہ مختلف نوعیت کے ہیں اس لیے اقبال کا یہ اسلوب نثر میں پوری طرح سما نہیں سکا۔ اس زاویے سے دیکھیے تو تحریکِ اقبال نے اُردو نثر کی فطری نشوونما میں کچھ زیادہ حصّہ نہیں لیا۔ اور یہ متذکرہ تحریک کا خاصا کمزور زاویہ ہے۔"

"رُومانیت مخزن اور اقبال" میں انھوں نے رومانیت کی تعریف اور پھر اس کا مخزن سے تعلق بیان کیا ہے۔ اس کی روشنی میں انھوں نے اقبال کی رومانیت کو

سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اقبال کی ابلیس سے دلچسپی کو ان کی رومانیت کا حصّہ قرار دیا ہے اور اسی روشنی میں ان کے مردِ مومن کے تصوّر کو واضح کیا ہے۔ اس مضمون میں بھی وہ رومانیت کے سحر میں گرفتار نہیں ہوتے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اقبال کے ہاں کلاسیکی نقوش بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اگلا مضمون اسی عنوان سے مزیّن ہے۔

اقبال ایک شاعر تھے اور عظیم لوگ کسی ایک صفت میں محدود ہو کر نہیں رہ جاتے ان کی شخصیّت کی تعمیر مختلف رنگوں سے ہوتی ہے۔ ان کے ہاں رومانیت اور کلاسیکیت اس طرح آپس میں گھُل مل جاتی ہیں کہ ان کو خانوں میں بانٹنا ممکن نہیں رہتا۔ ڈاکٹر انور سدید بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔

وہ اقبال کی شاعری میں رومانیت کے نقوش جابجا نظر آتے ہیں اقبال کا تصوّرِ عشق رومانیت کی خوبصورت ترین تعبیر ہے۔ تاہم ان کے عظیم موضوعات، شائستہ اسلوب، عظمتِ تاریخ کا گہرا احساس اور غیر شخصی انداز پیشِ نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اقبال کی شاعری کسی لاابالی ذہن کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پسِ پشت سالہا سال کا تفکر مطالعے کی گہرائی، علومِ جدیدہ کا مطالعہ اور ان کا گہرا عالمانہ تجزیہ اپنا اثر و عمل بروئے کار لا رہا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں حرکت و حرارت کے باوجود فکری توازن، استدلالی ٹھہراؤ اور داخلی نظم و ضبط کی نہایت بھی ملتی ہے۔ ان سب خصوصیات نے ان کے تجربے کو گھمبیرتا، تجزیے کو صداقت اور اظہار کو گہرائی عطا کی اور وہ نہ صرف مستقبل پر اثر انداز ہوئے بلکہ مستقبل نے بیشتر انہیں کے نظریات کی روشنی میں اپنی تعبیر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اقبال اپنے رومانی تصورات کے باوجود ایک ایسے شاعر کی صورت میں نمایاں ہوئے جن میں کلاسیکی خصوصیات بھی موجود ہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید صاحب اپنی بات کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں اور متعلقہ موضوع پر موجود مواد پر ان کی نظر رہتی ہے۔ مگر اقبال کے تصوّرِ حیات و مرگ پر لکھتے ہوئے وہ اقبال کے خطبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس مضمون میں اس طرح کے فقرے راہ پا گئے ہیں۔

"ہارٹ مین کا قول ہے کہ زندگی سے مادے کی نفی موت ہے۔ اقبال نے

اس خیال کی تائید نہیں کی بلکہ وہ سپائی نوزا کے اس خیال کو شدت سے قبول کرتا ہے کہ انسانی رُوح خدا کا عکس ہے اور کائنات کا رومانی زاویہ پیش کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں جزو اور کُل کا رشتہ بندے اور خدا کا رشتہ ہے جس طرح کُل یعنی خالقِ کائنات کو زوال نہیں اسی طرح جزو اپنی لاشخصی حیثیت میں دُوری ہے اور موت اس مقامِ اتصال کا نام ہے جب تھوڑے عرصہ کے لیے جزو کا تحرک رک جاتا ہے اور وہ کُل کی ایک نئی شکل میں ہی سما جاتا ہے۔"

یہ درست ہے کہ اقبال انسان کو جزو اور خدا کو کُل قرار دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ کائنات کو بھی وہ جزو ہی قرار دیتے ہیں۔ انسان کے جزو ہونے میں فرق یہ ہے کہ اس کی خودی مضبوط ہے اور وہ فنا نہیں ہوتی۔ انسان جزو کی حیثیت سے خدا سے نکلا ضرور ہے مگر وہ دوبارہ خدا کی ذات میں ضم نہیں ہوتا۔ موت اقبال کے نزدیک خدا سے اتصال کا نام نہیں ہے بلکہ خودی کے انتقالِ مقام کا نام ہے۔ اقبال خدا کو سمندر اور انسان کو موتی قرار دیتے ہیں جو پیدا تو سمندر ہی سے ہوتا ہے مگر پھر اپنی ہستی کو برقرار رکھتا ہے۔

انھوں نے بقائے دوام کے تصور پر اپنے چوتھے خطبے میں تفصیل سے لکھا ہے بہر حال اس اختلاف کے باوجود زیرِ نظر کتاب اقبالیات میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ارشاد متین، انور سدید، اصغر تبسم، عالم انور، ممتاز گیلانی، وزیر آغا، علی تنہا (بہاولپور)

ریاض صدیقی

وزیر آغا ۔ ایک مطالعہ

ادبی کتابوں کے تبصرے کی فہرست میں ایک اہم ادبی کتاب "ڈاکٹر وزیر آغا ۔ ایک مطالعہ" ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ضخیم اشاعت ڈاکٹر انور سدید کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ برِ عظیم کی ادبی تاریخ و تہذیب میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک بڑی قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ جدید اُردو تنقید اور جدید علامتی شاعری خصوصاً نظم اور انشائیہ نگاری ایسی سمتیں ہیں جن میں ان کی تحریروں، تخلیقی کاوشوں اور افکار و نظریات نے پورے برِ عظیم کے نئے ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔ آنے والوں اور آنے والے زمانوں پر اثر انداز ہونے کا عمل ایک ایسا اعزاز ہے جو فیض اور ڈاکٹر وزیر آغا کو حاصل ہے اور یہی اعزاز ادب میں حقیقی کامیابی اور بڑائی کی سند ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جو خود بھی ایک معتبر اور صاحبِ نظر نقادوں کی چھوٹی سی فہرست میں اپنا مقام رکھتے ہیں، صحیح وقت پر ایسے قد آور تخلیق کار کی شخصیت اور اس کی مجموعی کارکردگی کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ قلمبند کر کے ادبی تاریخ اور دھارے کو ایک رُخ دیا ہے۔ کتاب کی موضوعاتی فہرست میں "تخلیقی زاویے" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری۔ انشائیہ نگاری اور غیر رسمی مضامین پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ادبی موضوعات کو ممکنہ پہلوؤں کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ "تجزیاتی زاویے" کے عنوان سے ان کی چند منتخب نظموں اور انشائیوں

کا تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ نظموں میں مختصر نظموں کے علاوہ ان کی معرکۃ الآرا طویل نظم "آدھی صدی کے بعد" بھی شامل مطالعہ ہے۔ "تنقیدی زاویے" کے عنوان میں ان کی تنقید اور اقبال کے سلسلے میں ان کے مجموعی کام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں ان دیباچوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، جو ڈاکٹر وزیر آغا نے وقتاً فوقتاً مختلف کتابوں پر تحریر کیے ہیں۔ تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے ان کی ٹیکنیک پر بڑی پُر مغز بحث قلم بند کی ہے۔ صحافت اور ادب کا رشتہ بیسویں صدی میں نشوو ارتقا سے گزر کر ایک منزل پر آ ٹھہرا ہے۔ اس صدی میں ادبی صحافت نے بہت سے چھوٹے بڑے نام پیدا کیے ہیں اور بعض بڑے نام مثلاً سر سیّد، نیاز فتح پوری، مولانا عبد الحلیم شرر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا صلاح الدین احمد، صہبا لکھنوی، حکیم یوسف حسن وغیرہ ادبی حوالہ بن کر زندہ ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس میدان کو سر کیا ہے۔ اور اس میں اپنا ایک جداگانہ اور متعین مقام حاصل کر لیا ہے۔ ان کی اس حیثیت پر جو کہ بہت مستحکم ہے ادبی و علمی نقطہ نظر سے مطالعہ کی ضرورت تھی۔ "ڈاکٹر وزیر آغا — ایک مطالعہ" کے مصنف نے "صحافتی زاویے" کے عنوان سے اس پہلو کو بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ سمیٹا ہے۔ اس کتاب کا ایک اور اہم باب "شخصی زاویے" ہے۔ اس باب میں ان مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے لکھنے والوں کے درمیان ہوئے۔ ادبی و علمی مباحث اور مکالموں کی اپنی معنوی اہمیت ہے جس سے مثبت اختلافِ نظر کے ورق کھلتے ہیں اور نظامِ خیال کو نشوو ارتقا کا راستہ ملتا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط کو بھی عنوان بنایا گیا ہے۔ کتاب کا اہم باب "اردو ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقام" ہے۔ یہ بحث پورے مطالعہ کا نچوڑ ہے — ڈاکٹر انور سدید نے مدلل مداحی سے بچتے ہوئے اس عنوان کو پوری سنجیدگی اور دیانتداری کے ساتھ تمام کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں غزلوں، انشائیوں اور نظموں کا مختصر سا انتخاب بھی شامل ہے۔ کتاب میں مختلف عنوانات کے دائرے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے شاعری کا اتنا مختصر انتخاب اور تنقیدی

مضامین کے نمونوں کا نہ ہونا ایک کمی ضرور ہے جس کو آیندہ ایڈیشن میں پورا کرنے کی کوشش ہونا چاہیئے۔ بہرحال "ڈاکٹر وزیر آغا۔ ایک مطالعہ" ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، انور سدید، ممتاز مفتی (اسلام آباد)

سلیم آغا قزلباش

ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری

کسی زبان کے ادیبوں کی سال بھر کی تحریروں کا شمار کرنا اور اُن پر بقدرِ ضرورت رائے دینا "ادبی جائزہ" کہلاتا ہے، اب اس قسم کے ادبی کام کو "جائزہ نگاری" سے بھی موسوم کیا جانے لگا ہے۔ سالانہ جائزہ نگاری دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ادب کا سالانہ جائزہ ادیبوں کا پورے ایک سال پر پھیلا ہوا "اعمال نامہ" ہے جس سے ان کی تخلیقی اور ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ بھی ہے جس میں اہلِ قلم اپنی نگارشات کا چہرہ دیکھ کر آئندہ کے لیے اپنا تخلیقی لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں اور اسے اپنی سالانہ رپورٹ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں سالانہ ادبی جائزوں کی ضرورت اس لیے محسوس کی جانے لگی ہے کیونکہ وقت کی برق رفتار تبدیلیوں نے لوگوں کو بہت مصروف کر دیا ہے۔ ایک عام آدمی کا تو ذکر ہی کیا ہے بڑے بڑے ادبا اور نقاد بھی ایک سال میں چھپنے والی سب کتابوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے، ادبی جائزہ ان کے اپنے ادبی کام کی رفتار اور نہج کا اندازہ لگانے میں مدد دیتا ہے اور انہیں دوسرے ادیبوں کے کام کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس زاویے سے ادبی جائزے کو تخلیق نما یا ادب پیما بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کئی سالوں سے جائزہ نگاری کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں

انہوں نے اس قسم کی جائزہ نگاری کی ابتدا کا سہرا گارساں دتاسی کے سر باندھا ہے۔ حالانکہ انہوں نے خود اتنے جائزے لکھے ہیں کہ یہ سہرا اپنے سر پر بھی باندھ سکتے تھے۔ لیکن جس استقلال اور لگن سے وہ جائزے لکھ رہے ہیں اس سے یہ کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے جائزہ نگاری کو ایک صنفِ ادب کا درجہ دے دیا ہے اور اس کے فنی رموز بھی خود متعین کیے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ ادبی جائزے جو ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۷ء تک کے عرصہ پر محیط ہیں کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ انہوں نے ایک سال کے دوران منظرِ عام پر آنے والی کتابوں اور تخلیقات کا مطالعہ کتنی محنت سے کیا ہے، ہر کتاب اور تخلیق کے نفسِ مضمون اور بنیادی جوہر تک پہنچنے میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے اور ہر کتاب اور تخلیق پر رائے دینے میں کتنی کشادہ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ چند لفظوں میں پوری کتاب کا لبِ لباب پیش کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، مگر ڈاکٹر انور سدید اس مشکل کام سے بخیر و خوبی عہدہ برا ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے مطالعے کی وسعت اور لگن کو آشکار کیا اور اپنی تنقیدی بصیرت اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

دوسری خاص بات جو مجھے ان کی سالانہ جائزہ نگاری میں نظر آئی ہے وہ اُن کی قوتِ مشاہدہ اور جوہر کو تلاش کر لینے کی پختہ ناقدانہ صلاحیت ہے۔ وہ مقناطیس کی طرح جوہرِ قابل کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں اور پھر اس کا ذکر فراوانی اور کشادہ جبینی سے کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں زمانہ کی بے اعتنائی کی وجہ سے دھول اور مٹی میں گم ہو جانے والے لعل و جواہر کو جاننے کا موقع دستیاب ہو جاتا ہے۔ اور ایسی تخلیقات کا علم بھی ہو جاتا ہے جن تک ہماری رسائی پہلے نہیں تھی۔ انور سدید کی جائزہ نگاری کا یہ حاصل بے حد مثبت ہے۔

کامیاب جائزہ نگاری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ جائزہ نگار کا رویہ ہمدردانہ، تنقیدی نقطۂ نظر "متوازن" ہو۔ مجھے ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ ادبی جائزوں میں یہ دونوں اوصاف بطورِ خاص کارفرما نظر آتے ہیں، اور پتہ چلتا ہے کہ وہ ادبی جائزہ نگاری کے بنیادی تقاضوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کے سالانہ جائزوں کے مطالعہ کے دوران مَیں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے سال بھر میں ادب کی کہکشاں میں جلنے بجھنے والے ہر ادیب پر اس کے تخلیقی تحرک کے مطابق ہی نگاہ ڈالی ہے۔ اپنے غیر جانبدارانہ اور ہمدردانہ تنقیدی رویے سے تخلیق کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ مطالعے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور تخلیق کا دائرہ روشن ہو جاتا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ انہوں نے یہ رویہ ڈاکٹر وزیر آغا اور مولانا صلاح الدین احمد سے حاصل کیا جن کے فیضانِ نظر کا اعتراف انہوں نے

ہمیشہ کیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے سالانہ ادبی جائزوں کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں قابلِ مطالعہ ہونے یعنی READABILITY کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ عام طور پر سالانہ ادبی جائزے ایسے روکھے پھیکے اور مردم بیزار انداز میں رقم کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا جمائیاں لینے لگتا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر انور سدید کے جائزوں میں اسلوبِ بیان کی لطافت اور رواں دواں کیفیت ہے قاری ذہنی طور پر ان کے مطالعے میں تخلیقی طمانیت محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری "گروہ بندی" کے وائرس کا شکار بھی نہیں ہے جبکہ دوسرے متعدد جائزہ نگاروں کے ہاں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ جائزہ لیتے وقت دوست اور دشمن کی تفریق کو کسی نہ کسی سطح پر ضرور پیشِ نظر رکھتے ہیں اور بدانصافی سے ترازو کا پلڑا مرضی کے مطابق جھکانے اور ڈنڈی مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جب کہ انور سدید کے جائزے ان کے غیر جانبدارانہ مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ وہ ادیب کی شخصیت سے زیادہ اس کی تخلیقات کو اہمیت دیتے ہیں اور اچھی تخلیق جہاں بھی نظر آئے اس کا ذکر محبت سے کرتے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جائزہ نگار کہنہ مشق ادیبوں کی ایک سال کے دورانیہ میں شائع ہونے والی کمزور تحریروں کو اُن کے سابقہ ریکارڈ کی روشنی میں رعایتی نمبر دینے سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ یہ چیز سالانہ ادبی جائزے کی اصلی روح کے منافی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس قسم کے طریقِ کار کے حق میں نہیں ہیں۔ اور انہوں نے تخلیق کے فنی معیار کی اساس پر ہی اپنی رائے مرتب کی ہے۔ چنانچہ بعض اوقات بڑا ادیب اپنی تخلیق کی کمزوری کی وجہ سے ذکر سے محروم رہ جاتا ہے لیکن نیا ادیب اپنی تخلیقی توانائی کی بنیاد پر نمایاں حیثیت پا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انور سدید نے بڑے ادیبوں کا خوشامدی رویہ اختیار کرنے کے بجائے نئے ادیبوں کو متعارف کرانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ دوستوں کا ذکر کیا ہے تو اپنے ادبی مخالفین کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور یوں اپنی دیانت تنقید کو قائم رکھا ہے۔ اسے تعلقات کی نذر نہیں ہونے دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ایک انجینئر بھی ہیں اور انجینئرنگ کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی چیز کو تعمیر کرنے سے پہلے اس کی لمبائی، چوڑائی اور گہرائی کا مکمل نقشہ کاغذ پر منتقل کر دیا جائے اور پھر اس نقشے کی پیروی کی جائے۔ انور سدید نے انجینئرنگ کے اس اصول کو ادب اور تنقید میں کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کا نقشہ تیار کر لیتے ہیں۔ جائزہ نگاری میں بھی وہ اس قسم کا خاکہ پہلے بناتے اور اس خاکے میں اصناف کے حوالے سے رنگ بھرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ادب کا

سالانہ جائزہ لکھنے سے قبل وہ سال بھر میں منصۂ شہود پر آنے والی تخلیقات کے مقام اور حیثیت کا پورا نقشہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ سال بھر تیاری کرتے اور حوالے مرتب کرتے ہیں۔ ہر نئی تخلیق پر تاثر لکھتے ہیں، اور ضروری تراشے فائل میں جمع کرتے جاتے ہیں۔ اس مواد کی اساس پر وہ سالانہ ادبی جائزہ سپردِ قلم کرتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ادبی جائزوں میں ایک خاص ترتیب اور توازن کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ان میں جامعیت بھی ہے اور وسعت بھی۔ اور ان سب کی وجہ سے ان کے جائزوں کی توقیر میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کا ادبی نقطۂ نظر بھی ان کے جائزوں کے عقب میں صاف دکھائی دیتا ہے چنانچہ ان کی حیثیت، محض کمنٹری کرنے والے شخص کی سی نہیں بلکہ وہ اس دور کے کارزارِ ادب میں بھی شریک اور دوسروں کے ہم سفر نظر آتے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عنصر کی شمولیت کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے معروضی رویے پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ ان کی جائزہ نگاری کا ایک اور اہم پہلو جو ہمارے مشاہدے میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ جائزے ادب میں پنپنے والے اُن مختلف رجحانات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جو گزشتہ دس برسوں میں کسی نہ کسی حوالے سے ادب میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر رونما ہونے والے بیشتر سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی عوامل جن سے ادیب کی تخلیقات نے اثر قبول کیا۔ یا جو ادیب کو مختلف زاویوں سے سوچنے پر ابھارتے رہتے ہیں ان کا ایک خاکہ بھی ان جائزوں سے ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہو جاتا ہے۔

کرکٹ کے ایک روزہ میچ اور ادب کے سالانہ ادبی جائزے میں مجھے ایک گونہ مماثلت دکھائی دی ہے، ان دونوں میں دلچسپی، ایک مخصوص تجسس کی مرہونِ منت ہے۔ اور فیصلہ فوری طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے برعکس پانچ دنوں پر مشتمل کرکٹ ٹیسٹ میچ اور پانچ یا دس سالوں پر پھیلے ادبی جائزے میں ٹھہراؤ، انتظار اور انتخاب کا طریق نمایاں ہے۔ بے شک کھلاڑی اور ادیب کی پوری ——— CONTRIBUTION کا اندازہ اس کی ساری کارکردگی کے مفصل جائزے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ تاہم اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کرکٹ کے نامور کھلاڑی کی بنائی ہوئی سنچریاں اور بڑے بڑے ادبا کے تخلیقی کارنامے تو زیادہ تر ریکارڈ کی تاریخی کتابوں ہی میں بند ہو جاتے ہیں جب کہ یک روزہ میچ اور ادب کے سالانہ جائزے میں نئے اور کم شہرت والے لوگوں کو بھی عوام سے متعارف ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ گویا سالانہ ادبی جائزہ ادب کے بڑے بڑے برگدوں کے سائے میں سے ابھرنے والے ادبا کو بھی روشناس کرا دیتا ہے اور یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ ان نئے لوگوں میں بڑا ادیب بننے کی صلاحیت

ہے ۔ یہاں مقصد سالانہ ادبی جائزوں کی قدر و منزلت کو کم کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ ادب کے سالانہ جائزے میں ہنگامی نوعیت کے مضامین نظم و نثر کے ذکر کے بجائے ایسی تخلیقات کو زیادہ اہمیت ملنی چاہیئے جو کچھ عرصہ تک زندہ رہنے والی ہوں۔ اس سلسلے میں اکثر جائزہ نگاروں نے تعلقات کو فوقیت دی اور انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا مگر انور سدید کے جائزوں کی یہ خوبی منفرد ہے کہ ان میں ہنگامی قسم کی تحریروں کو اہمیت نہیں دی جاتی ، وہ صرف ادبی اوصاف کی حامل تحریروں کا ذکر کرتے ہیں ، ڈاکٹر انور سدید کی تنقید کو چونکہ اعتبار حاصل ہے اس لیے وہ کسی ادیب کا ذکر خواہ ناموں کی فہرست میں ہی کیوں نہ کریں اہمیت اختیار کر جاتا ہے ۔ چنانچہ انور سدید کی جائزہ نگاری نے غیر اہم لوگوں کو بھی اہم بننے کا موقعہ عطا کیا ہے ، اور تنقید کی جراحت سے احتراز کر کے نئے لکھنے والوں کو ثباتِ فن عطا کیا ہے ۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر انور سدید کی جائزہ نگاری اپنی جامعیت ، توازن اور بے لاگ رویئے کی بنا پر ایک نہایت قابلِ قدر چیز بن گئی ہے اور یہ ان کی ادبی شخصیت کی ایک ایسی جہت ہے جس میں ان کا دوسرا کوئی مثل نہیں ، اور اب اسے تنقید کی ایک الگ شاخ کے طور پر قبول کرنا بے حد مناسب ہے ۔ گارساں دتاسی نے جس سلسلے کو انیسویں صدی میں جاری کیا تھا اسے ڈاکٹر انور سدید نے خلوص ، استقلال اور ادبی لگن سے بیسویں صدی میں آگے بڑھایا ہے ، اور ادب کی بیش قیمت خدمت سرانجام دی ہے ۔ انہوں نے جائزہ نگاری کی نئی راہ متعین کر دی ہے ۔ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سے نئے چراغ روشن ہوں گے ۔ انور سدید کے ان جائزوں میں بلاشبہ اجمال ہے ۔ جو اخبار میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ناگزیر تھا ۔ میں انور سدید صاحب سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ سالانہ جائزے کو کچھ اور وسعت دیں اور ہر سال کے جائزے کی ایک مکمل کتاب لکھیں تاکہ ایک سال کے اجمال کے بجائے اس کی تفصیل ہمارے سامنے آ سکے ۔ مجھے یقین ہے کہ انور سدید صاحب میری گزارش کی پذیرائی کریں گے اور ۱۹۸۸ کے ادب کا جائزہ کتابی صورت میں عنایت کریں گے ۔

انتظار حسین

اُردو ادب کی تحریکیں

انور سدید کے حساب سے

ظاہر میں تو یہی لگتا ہے کہ انور سدید کا مشغلہ بس قلمی لڑائیاں لڑنا ہے۔ مگر شاید ایسی بات نہیں ہے۔ قلمی لڑائیوں کا شوق اپنی جگہ۔ سنجیدہ غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی مصروفیت اپنی جگہ۔ یوں دیکھئے کہ اِدھر کالم اور مراسلے اور دفاعی اور جارحانہ مضامین لکھ لکھ کر اغیار کے خلاف مورچے لگاتے رہے اور اُدھر چپکے چپکے ایک ایسے موضوع پر کام کرتے رہے جو تحقیق کی طالب تھا۔ اب ان کا یہ کام ہمارے آپ کے سامنے ہے۔ کتاب کی صورت میں جس کا عنوان ہے "اُردو ادب کی تحریکیں" ——— (ابتدائے اُردو تا ۱۹۷۵ء)

لیکن عنوان پر مت جائیے۔ ڈاکٹر انور سدید اُردو ادب سے بہت پیچھے سے شروع ہوئے ہیں۔ سمجھ لیجئے کہ ابتدائے آفرینش سے۔ مغرب میں جاکر قرونِ وسطیٰ کی مذہبی تحریکوں سے شروع ہوئے اور نشاۃ الثانیہ کلاسیکیت، رُومانیت، وجودیت، نئی نفسیات، آزاد تلازمۂ خیال، تجریدیت، علامیت، تاثیریت اور مارکسیت غرض ہر فلسفہ، ہر رجحان کو سمیٹتے چلے گئے۔ برِصغیر میں وہ آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتے ہیں اور بھگتی تحریک تک آتے ہیں۔

اس سب کچھ کے بعد انور سدید نے اُردو ادب کو ہاتھ لگایا ہے۔ یہاں وہ امیر خسرو سے شروع ہوتے ہیں اور ان کی دیسی شاعری کو ریختہ کی پہلی تحریک قرار دیتے

ہیں۔ ریختہ کی دوسری تحریک کا وہ دکنی شاعری میں جا کر سراغ لگاتے ہیں۔ اس تحریک کا نشان ان کی دانست میں ولی دکنی ہیں۔

ایہام کی تحریک، اصلاحِ زبان کی تحریک، فورٹ ولیم کالج کی تحریک، علیگڈھ تحریک، برہمو سماج اور آریہ سماج کی تحریک قسم کی تحریکوں سے انصاف کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ دلّی کالج، انجمن پنجاب، علامہ اقبال یہ سب انور سدید کی دانست میں اپنی اپنی جگہ تحریکیں ہیں۔ اس کے بعد رومانیت کی تحریک اور پھر ترقی پسند تحریک۔

انور سدید نے ترقی پسند تحریک کا بڑی تفصیل سے اور بڑی کاوش سے جائزہ لیا ہے جو قابلِ قدر ہے۔ مگر اسی عمل میں ان کے لیے یہ سوال پیدا ہوتا نظر آتا ہے کہ ان رجحانات اور ان لکھنے والوں کا کیا بندوبست کیا جائے جو ترقی پسند تحریک کے ذیل میں بھی نہیں آتے اور پچھلی کسی تحریک یا رجحان کی توسیع بھی نہیں ہیں۔ انور سدید نے راستہ یہ نکالا کہ ان سب کو حلقہ اربابِ ذوق کے خانے میں سمیٹ دیا جائے۔ سو حلقہ اربابِ ذوق کے افسانے کے ذیل میں ہمیں منٹو اور محمد حسن عسکری بھی نظر آتے ہیں۔ اور حلقہ کی شاعری کے ذیل میں مجید امجد بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عسکری صاحب کی تنقید بھی حلقہ کی تنقید کے خانے میں چلی گئی۔

اب میں انور سدید صاحب سے پوچھتا ہوں کہ فراق کی تنقید اور فراق کی غزل کس خانے میں جائے گی اور ممتاز شیریں کی تنقید کس خانے میں جائے گی۔ کیونکہ وہ ترقی پسند تو ہیں نہیں اور حلقہ کی رکن بننے اور اس کے کسی جلسے میں اپنی تحریر پڑھنے کا شرف بھی انھیں حاصل نہیں ہوا۔ یہ دو نمایندہ مثالیں میں نے لے لی ہیں ایسے اور بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

انور سدید کے ہاں یہ قباحت دو وجوہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ انھوں نے اس بڑی تحریک کو نظر انداز کیا جو "نیا ادب" کی تحریک کہلاتی تھی۔ دوسری اس وجہ سے کہ وہ حلقہ اربابِ ذوق کو اس قسم کی تحریک سمجھ رہے ہیں جیسے ترقی پسند تحریک تھی۔

اگر انور سدید "نیا ادب" کی تحریک کو درخورِ اعتنا سمجھ لیتے تو وہ ان قباحتوں سے بچ جاتے۔ وہ "نیا ادب" کی تحریک تھی جو ترقی پسند ادب، حلقہ اربابِ ذوق اور ان لکھنے والوں کے درمیان جو ان دونوں میں سے کسی سے وابستہ نہیں تھے، رشتہ پیدا کرتی تھی۔ اور حلقہ اربابِ ذوق کا دائرہ تو اس اعتبار سے بھی محدود تھا کہ یہ انجمن تو لاہور میں سرگرم تھی یا دلّی میں اس کی ایک

شاخ قائم ہوئی تھی۔ برِصغیر کے باقی شہروں میں ایسے نئے لکھنے والوں کو کہاں سمیٹا جائے گا۔ جو ترقی پسند تحریک سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے اور روایت سے بغاوت کر رہے تھے۔ اور کیا منٹو صاحب اور عسکری صاحب اس وجہ سے حلقہ اربابِ ذوق مارکہ ادیب کہلائیں گے کہ انہوں نے قیامِ پاکستان لاہور آکر اپنی چند تحریریں حلقہ کی نشستوں میں پڑھیں اور رکنیت کا فارم پُر کر دیا۔ مگر اس کی رکنیت کا فارم تو مختلف ایسے ادیبوں نے بھی پُر کیا تھا جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا اور جو حلقہ میں سرگرم بھی رہے ہیں۔

اصل میں حلقہ اربابِ ذوق کسی مخصوص مکتبۂ فکر کا نام نہیں تھا۔ یہ تو ایک آزاد قسم کا فورم تھا جو کسی نظریے سے زیادہ "نیا ادب" کی تحریک کی رُوح سے ہم آہنگ تھا۔

جسے ہم نئی شاعری کہتے ہیں وہ تخصیص کے ساتھ حلقہ اربابِ ذوق کا شاخسانہ نہیں تھی بلکہ "نیا ادب" کی تحریک کا حصّہ تھی۔ مجید امجد اور اختر الایمان کی شاعری کو ہم اسی حساب سے سمجھ سکتے ہیں۔

انور سدید نے آگے چل کر پاکستانی ادب کی تحریک پر گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ اس تحریک کے علم بردار حلقہ اربابِ ذوق کے ایک رکن محمد حسن عسکری تھے۔" پھر ادیب اور ریاست سے وفاداری کی بحث کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ

> "ڈاکٹر تاثیر، مولانا صلاح الدین احمد، پطرس بخاری، میاں بشیر احمد، شیر محمد اختر، یوسف ظفر، قیوم نظر اور شورش کاشمیری جو ترقی پسند تحریک کے نظریات سے متفق نہیں تھے ۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کے اعلان سے الگ ہو گئے اور حکومت نے سویرا، نقوش اور ادبِ لطیف وغیرہ رسائل پر جو تحریک کے ترجمان تھے پابندی عائد کر دی۔"

یہ دونوں بیانات کچھ غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی ادب کی تحریک میں حلقہ اربابِ ذوق پیش پیش تھا۔ پھر ایک مرحلہ پیش آیا کہ اس سوال پر حلقہ کے ادیبوں نے بالخصوص شیر محمد اختر، یوسف ظفر اور قیوم نظر نے ترقی پسند ادیبوں کے نقطہ نظر سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کیا۔ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ پاکستانی ادب کی تحریک میں حلقہ اربابِ ذوق نے کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ اس تحریک میں یا اس بحث میں ترقی پسندوں سے جو ادیب الجھے ہوئے تھے، وہ حلقہ سے باہر تھے۔ ڈاکٹر تاثیر تو خود ترقی پسند تحریک سے

ٹوٹ کر آئے تھے۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں کا حلقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عسکری صاحب حلقہ کی نمائندے کی حیثیت سے اس جنگ میں شامل نہیں تھے۔ جو شاعر اس وقت حلقہ کی نمائندگی کر رہے تھے، وہ اس بحث میں شرکت ہی کو غیر ادبی فعل گردانتے تھے۔

اچھا پھر انور سدید نے حقیقت نگاری کی تحریک کا ذکر تو شدّومد سے کیا ہے اور بعض ایسے رجحانات کا بھی جو شاید تحریک کا درجہ نہیں رکھتے، مگر تجریدی اور علامتی افسانے کو انھوں نے کسی ذیل میں شمار نہیں کیا ہے۔

ان چند الجھنوں سے قطع نظر یہ کتاب تحریکوں کے مسئلہ پر ایک جامع بحث ہے اور یہ بھی اس کتاب کا اچھا پہلو ہے کہ ادبی تحریکوں کے واسطے سے ہم انسانی تاریخ کی مختلف تحریکوں سے روشناس ہو جاتے ہیں بلکہ اس پس منظر میں تو ادبی تحریکوں کی معنویت اور نمایاں ہوتی ہے۔

ہاں ۷۰۰ صفحات کی یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کراچی نے شائع کی ہے۔

غلام الثقلین نقوی انور سدید (سیالکوٹ)

سید حسن رضوی
انور سدید

روبرو

○

انور سدید ۴؍ دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام محمد انوار الدین ہے۔ انہوں نے بچپن میں ناول "بیاضِ سحر" پڑھا تھا جس کی مصنّفہ و۔ ب سدید صاحبہ ہیں۔ انہوں نے اپنا نام اسی ناول سے مستعار لیا۔ سدید کا لفظ ایک قرآنی آیت "قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا" میں بھی آتا ہے اور اسی آیت کے مطابق انور سدید کی شخصیت مرتّب ہوئی ہے۔

انور سدید ایک محنت کش انسان ہیں، انہوں نے اپنی زندگی اپنی محنت سے بنائی اور خدا کی عطا پر ہمیشہ شکر ادا کیا۔ تصنیف و تالیف ان کا پیشہ نہیں عشق ہے۔ اب تک ان کی پندرہ کتابیں چھپ چکی ہیں اور متعدد کتابیں تکمیل کے بعد زیرِ اشاعت ہیں۔

○

حسن رضوی: "آپ کی پہلی کاوش کس صنف میں تھی؟"

انور سدید: "میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں ہر نئے لکھنے والے کو پہلے شاعری بلکہ غزل کی شاعری اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں نے بھی ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پہلے

تک بندی ہی کی تھی اور اس پر گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا کے ڈرائنگ ماسٹر شاہ دین شاد صاحب نے مجھے اصلاح بھی دی تھی۔ ماسٹر عبدالکریم نے مجھے اسی زمانے میں عروض کا درس دیا اور چند معروف اور آسان بحروں میں تقطیع کرنا سکھایا۔ اُردو نثر میں میری پہلی کہانی رسالہ "گل دستہ" میں چھپی تھی جسے لالہ رگھوناتھ سہائے بچّوں کے لیے مرتّب کرتے تھے۔ بچپن کے اساتذہ میں سے مرزا محمّد منوّر کے والدِ گرامی مرزا ہاشم الدین اور خالد اقبال یاسر کے نانا مولوی محمّد بخش صاحب نے میری ادبی تربیت میں بہت حصّہ لیا ہے۔ اُردو کی کلاسیکی نثر سے متعارف کرانے میں ڈیرہ غازی خاں میں میری زیریں جماعتوں کے استاد مولوی پیر بخش صاحب نے میری راہ نمائی کی۔ شیر محمّد صاحب ایک دکاندار تھے جن کے پاس ملاپ، ویر بھارت اور زمیندار اخبار آتے تھے۔ میں سودا سلف لینے جاتا تو یہ اخبارات پڑھنے بیٹھ جاتا۔ ان صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ دکان پر جاتے ہی سب اخبارات میرے سامنے رکھ دیتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے مجھے لکھنے کی ترغیب بھی دی تھی۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔"

حسن رضوی: گویا آپ نے ابتدا شاعری سے کی۔ پھر افسانے کی طرف آ گئے؟

انور سدید: "جی ہاں۔ مجھے ساتویں آٹھویں جماعت میں داستانیں پڑھنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ کلاسیکی داستانوں کے علاوہ میں نے حفیظ جالندھری کی کتاب "عمر عیّار" اور عظیم بیگ چغتائی کی کتاب "قصرِ صحرا" بھی گہری دلچسپی سے پڑھی تھی۔ اور یہ میری محبوب کتابیں تھیں۔ اسی زمانے میں مجھے ولکی کالنس کے ناول "مون سٹون" کے ترجمے نے جو دارالاشاعت پنجاب لاہور سے "چندر ہیرا" کے نام سے چھپا تھا۔ بہت متاثر کیا۔ خان غلام حسین خان کے "شہابِ ثاقب" کا نام بھی میری لوحِ دماغ پر ثبت ہے۔ میرزا ادیب کے "صحرانورد کے خطوط" نے بھی مجھے بہت مسرّت فراہم کی اور مجھے صحرانورد کے ہر نئے خط کی اشاعت کا شدّت سے انتظار رہتا تھا۔ میٹرک تک میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، فیّاض محمود، عاشق حسین بٹالوی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، ممتاز مفتی کے کچھ افسانے پڑھ چکا تھا۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا پورا مفہوم یا اسرار اس وقت گرفت نہیں آتا تھا۔ اس سے مجھے افسانے

لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرا پہلا افسانہ فلمی رسالہ "چترا" میں چھپا جسے دین دیال بھاٹیہ مرتّب کرتے تھے۔ آپ سن کر شاید ہنسیں اور آپ کو ضرور ہنسنا چاہیئے کہ مجھے رسالہ "چترا" نے مصوّرِ جذبات کا خطاب دے رکھا تھا جو جلی حروف میں ہر افسانے کے ساتھ یوں چھپتا: "مصوّرِ جذبات حضرت انور سدید میانوی" میانی میری پیدائش کے قصبے کا نام ہے جو تحصیل بھلوال میں بھیرہ کے نواح میں دریائے جہلم کے کنارے آباد ہے۔ اب تو یہ قصبہ گم نام سا ہوگیا ہے لیکن کسی زمانے میں یہ کھیوڑے کے نمک کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ اور انگریزوں نے اسے ملکوال جنکشن کے ساتھ ریل سے ملا دیا تھا۔ پھر "بیسویں صدی" میں خوشتر گرامی نے میری انگلی پکڑی۔ کچھ عرصے کے بعد مظہر انصاری نے مجھے نامنظور مسودوں میں سے تلاش کیا اور "ہمایوں" میں جگہ دی۔ بعد میں میرے افسانے "عالم گیر" آج کل، ماہِ نو، مشہور، کہکشاں، کامران اور متعدد دوسرے رسائل میں چھپنے لگے۔ رام لعل، ریاض مرزا، منوّر اشرف، ست پرکاش سنگر، سعید امرت، غلام الثقلین نقوی، طفیل ملک، شوکت صدیقی، نجمہ انوار الحق، رضیہ فصیح احمد، اس دَور کے میرے معاصر افسانہ نگار ہیں اور ان میں سے چند ایک تو اردو افسانے کے آفتاب و ماہ تاب بن کر چکے۔ لیکن میں افسانے کے ساتھ زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔"

حسن رضوی: آپ افسانے سے تنقید کی طرف کس طرح آگئے؟

انور سدید: آپ کو معلوم ہے کہ میں انجینئرنگ کے پیشے سے متعلق ہوں۔ اور فیلڈ انجینئر کا کام تو اور بھی جان لیوا ہے۔ دن بھر پراجیکٹ پر کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ دو اڑھائی سو میل جیپ پر روزانہ سفر لاحق رہتا ہے۔ میں عملی زندگی میں داخل ہوا تو ادب کے فریضے سے غافل ہوگیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ محکمہ آبپاشی پنجاب کے ملازمتی دَور میں فطرت نے مجھ سے افسانہ لکھنے کا جوہر ہی چھین لیا، لیکن ادب سے عشق کا جذبہ ختم نہیں اور مطالعہ مسلسل جاری رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے تنقید لکھنے کی دعوت دی۔ میرا پہلا باقاعدہ تنقیدی مضمون جو سابقہ مطالعے کی اساس پر لکھا گیا تھا۔ "اوراق" میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا۔ "مولانا

صلاح الدین احمد کا اسلوب" یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ بعد میں باقاعدہ طور
تنقید کی طرف آگیا۔"

حسن رضوی : اب تک آپ کیا کچھ لکھ چکے ہیں ؟

انور سدید : "میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ شاید ایسا نہیں کہ میں کسی فخر کا اظہار کرسکوں میں اب تک لکھنے کا
ہی کر رہا ہوں۔ میرے لیے لکھنے کا عمل اپنے ذہن کی گرہیں کھولنے کا عمل ہے۔ میں نے ہمیشہ
ادب کا معمولی طالب علم رہنا پسند کیا ہے اور ذہن کی کھڑکی ہمہ اقسام کے تصورات
کے لیے کھلی رکھی ہے۔ تنقید میں "فکر و خیال"، "اختلافات"، "اقبال کے کلاسیکی نقوش"
"غالب کا جہاں اور" "اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش"۔ "میر انیس کی اقلیم سخن"
"وزیر آغا ایک مطالعہ" وغیرہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ "اردو ادب کی تحریکیں" میرا پی۔ ایچ
کا مقالہ ہے اور یہ بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ انشائیوں کی کتاب "ذکر اس پری وش کا" اور انشائیہ
کی تنقیدی کتاب "انشائیہ اردو ادب میں" شائع ہو چکی ہے۔ انشائیوں کا دوسرا مجموعہ "آسمان
میں پتنگیں" زیرِ طبع ہے۔ طنز و مزاح میں پیروڈی کا آزمایا اور غالب کے اسلوب میں
عصرِ حاضر کے ادب اور ادبی معاشرے کو موضوع بنایا۔ یہ پیروڈی "غالب کے نئے
خطوط" کے نام سے چھپی ہے۔ حال ہی میں اردو ادب کی مختصر تاریخ از ابتدا تا ۱۹۸۶
مکمل کی ہے۔ اردو ادب میں سفرنامہ کے عنوان سے بھی ایک مبسوط کتاب چھپ چکی ہے
بس یہی معمولی سا میرا کام ہے محض شوقیہ قلم کاری جس میں پھول کم اور پتھر زیادہ ملے
ہیں، مجھے اپنے معاصرین کے مقابلے میں پتھروں کا حصہ زیادہ ملا ہے۔"

حسن رضوی : "آپ جس رفتار سے لکھتے ہیں کیا پڑھنے کے معاملے میں بھی رفتار یہی ہے؟"

انور سدید : اس سوال کی روشنی میں اگر اپنا جائزہ لوں تو مطالعہ مجھے اپنی عادت اور
فطری ضرورت نظر آتا ہے۔ میں دن بھر کی محنت اور مشقت کے بعد جب تھک
چور ہو جاتا ہوں تو مطالعہ مجھے راحت اور سکون عطا کرتا ہے۔ انجینئرنگ کے پیشے
ذہن پر جو زنگ سا لگ جاتا ہے مطالعہ یہ زنگ اتار دیتا ہے۔ لیکن میں نہیں کہہ
سکتا کہ میں نے بہت پڑھا ہے۔ فی الوقت جتنی بڑی تعداد میں کتابیں چھپ رہی
ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کا دعوٰی کون کرسکتا ہے۔ میں نے بعض کتابیں بالاستیعاب
پڑھی ہیں۔ بعض کو صرف سونگھا ہے اور بعض کو ہاتھ لگا کر چھوڑ دیا ہے۔ بعض

کتابوں نے مجھے مقناطیس کی طرح کھینچا اور بعض سے میں نے شعوری طور پر دُور بھاگنے کی کوشش کی اور پھر" اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں"
اور سچ تو یہ ہے کہ جتنا کچھ پڑھنے کی کوشش کی کم مائیگی کا احساس اتنا ہی زیادہ ہوا۔ زندگی مختصر نظر آئی۔ اور خیال آیا کہ ادب کے بیشتر سرمائے تک تو میں رسائی ہی حاصل نہیں کر سکا۔ کتنی بڑی محرومی ہے یہ۔ کم از کم میں تو اسے شدت سے محسوس کرتا ہوں۔"

حسن رضوی: ہر ادیب اور شاعر اپنے ابتدائی دور میں کسی نہ کسی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اب تک تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا سے متاثر ہیں۔ کیا ان کے علاوہ بھی کچھ ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے آپ پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں؟

انور سدید: میری ادبی زندگی میں ــــ یعنی اگر اسے ادبی زندگی کہنا مناسب ہے تو اس میں وزیر آغا نے ایک رہنما ستارے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ عبدالعزیز خالد صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "وزیر آغا انور سدید کے گورو دیو ہیں"۔ اس پر بعض لوگوں نے میرا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خالد صاحب نے درست کہا تھا۔ آغا صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو جمالِ ہمنشیں کے اثر کرنے کا موقع پیدا نہ ہوتا اور میں محکمہ آبپاشی کی دلدل میں ہی زندگی گزار دیتا۔ انھوں نے مجھے تنقید لکھنے کی دعوت دی۔ اور استدلال کو خنک مزاجی سے استعمال کرنے کا طریق سکھایا۔ انشائیہ کی طرف پیش قدمی بھی ان کا ہی جمالِ ہم نشیں ہے۔ انہوں نے ہی مجھے ایم اے کرنے کی ترغیب دی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی میں رہنمائی کی۔

مجھے ابتدائی دور میں جن مصنّفین نے متاثر کیا ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس دور کے رومانی ادیبوں نے مجھے مسحور کیے رکھا۔ محمد حسین آزاد، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی میرے محبوب مصنّفین میں سے تھے۔ سجّاد انصاری کا بھی میں گرویدہ تھا۔ فلک پیما کا مطالعہ بھی مجھے بہت مرغوبِ خاطر تھا۔ تنقید میں بھی مجھے وہی مصنّفین پسند ہیں جن کا اسلوب تخلیقی اور نثر رومانی ہے۔ میری مراد ڈاکٹر

خورشید الاسلام، سیّد وقار عظیم، آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی اور مولانا صلاح الدین احمد سے ہے۔

حسن رضوی: ایک جگہ آپ نے ڈاکٹر وحید قریشی سے تاثر قبول کرنے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

انور سدید: "ان کا تاثر جداگانہ نوعیت کا ہے۔ وحید قریشی صاحب بات کو دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں، صداقت کو برملا پیش کرتے ہیں۔ ادبی قدروں کا احترام کرتے ہیں۔ میں نے ان سے بزم میں رزم پیدا کرنے کا اور رزم میں ثابت قدم رہنے کا ڈھنگ سیکھا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ تنقیدی عمل بھی معرکۂ خیر و شر ہے اس میں لڑنے، لپکنے، پلٹنے اور جھپٹنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ لہو گرم رہتا ہے شاید تنقید راجپوتی شان اور مزاج کی صنفِ ادب ہے اس لیے مجھے اس میں زیادہ مزہ آتا ہے"

حسن رضوی: اچھا تو اب یہ بتائیں کہ آپ کا نظریۂ فن کیا ہے؟

انور سدید: معاف کیجئے اس قسم کے سوالات سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ادب کے لیے کوئی مینی فیسٹو بنا رکھا ہے جس میں میں نے خود کو اسیر کر رکھا ہے۔ فن زندگی کے خارج اور انسان کے داخل میں ربطِ باہم پیدا کرتا ہے۔ فن کی تخلیق ہی اس کا انعام ہے۔ ترفع تو پیشہ ورانہ کاری گری کو بھی حاصل ہے لیکن کاری گر پسینہ خشک ہونے سے پہلے اپنی محنت کی اور کاری گری کی قیمت وصول کر لیتا ہے جبکہ فن کی رفعت کلیمانہ ہے۔ محسن کار تخلیقِ فن کے سحر میں مسحور رہتے ہیں جبکہ کاری گر قسم کے ادبا دولت، شہرت اور ناموری کے حصول میں کوشاں ہو جاتے ہیں اور متاعِ قلم فروخت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتے ہیں۔ اوّل الذکر ادبا، ادب کے صوفی، اولیا، بھگت اور رشی ہیں اور مؤخر الذکر کو ادب کی طوائفیں کہا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اوّل الذکر نے لفظ سے بیعت کر رکھی ہے۔ مؤخر الذکر لفظوں کی حرمت کا نیلام بازار میں اٹھاتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس قسم کے ادیبوں کے ہی خریدار ہیں۔ اور یہ بکنے کے لیے ہمہ وقت تیار"

حسن رضوی: انور سدید صاحب! کیا آپ اپنی تحریروں کا معاوضہ وصول نہیں کرتے اور کیا ادیب محنت کش نہیں جسے مناسب زندگی گزارنے کے لیے

وسائل اور روپیہ پیسہ درکار ہے؟

انور سدید: "حسن رضوی صاحب۔ میں نے داخل کی آواز سننے والے ادیبوں اور خارج کے حکم پر لکھنے والے محرّروں کا مابہ الامتیاز بیان کیا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ ایسا ادب پیش کرتے ہیں جس کی قیمت سکۂ رائج الوقت میں ادا نہیں کی جاسکتی۔ دوسری قسم کے لوگ ادب کے بجائے پوسٹر لکھتے ہیں۔ پروپیگنڈے کی پست سطح پر اتر آتے ہیں۔ میری نظر میں یہ قلم فروشی کا عمل ہے جو ادیب کو روپے کے حصول کی چوہا دوڑ میں شامل ہونے اور دوسروں کو مونڈھا مار کر مسابقت حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ رہی میری بات تو گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا۔ میں تو ادب کے وسیلے سے اپنی تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے لکھا ہی کیا ہے؟"

حسن رضوی: ابھی آپ نے بہت سی کتابوں کے نام لکھوائے ہیں، آپ سرکاری پرچوں میں بھی لکھتے ہیں، اکادمی ادبیات، مقتدرہ قومی زبان اور رائٹرز گلڈ کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

انور سدید: "بھائی میں نے لکھنے سے پہلے کبھی نہیں سوچا کہ اس کا کچھ معاوضہ ملے گا سرکاری پرچے، اکادمی ادبیات اور رائٹرز گلڈ جیسے ادارے ادیبوں کو کیا دیتے ہیں؟ ان سے زیادہ تو میں کتابوں کی خریداری، کاغذ، قلم اور روشنائی پر خرچ کر ڈالتا ہوں۔ اس وقت کمرشل ادیب کو جو معاوضہ ملتا ہے وہ کاتب کی فی صفحہ کتابت سے بھی کم ہے اور وہ بھی یک مشت نہیں دیا جاتا قسطوں میں ادا ہوتا ہے۔ ادیب کی انا کو مجروح کر کے۔ اسے ترسا ترسا کر۔ ادب سے میرا تعلّق غیر پیشہ ورانہ ہے، ادب میرا عشق ہے۔ میری عبادت ہے۔ میں نے اس سے مادی فائدے کو کبھی منسلک نہیں کیا۔ میں نے جب "اردو ادب کی تحریکیں" پر مقالہ لکھا تو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اس مقالے سے حاصل ہونے والی مسرّت کے سامنے ہیچ نظر آنے لگی تھی۔"

حسن رضوی: آپ نے اپنی تحریروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیہ کا موجد قرار دیا ہے۔ جبکہ یہ صنفِ ادب مغرب سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا آپ انشائیہ کو

اصنافِ ادب اُردو میں اہم کردار شمار کرتے ہیں ؟

انور سدید : انشائیہ واقعی اُردو نثر کی اصناف میں ایک اہم صنفِ ادب ہے، جس کا اپنا ایک الگ مزاج ہے اور بے شمار ایسی باتیں جو دوسری اصنافِ ادب میں نہیں کی جاسکتیں اس صنف میں آسانی سے اور مؤثر انداز میں پیش کر دی جاتی ہیں۔ اس صنف کے اپنے قواعد و ضوابط اور حدودِ فن ہیں میں اس قسم کی بیشتر مباحث پر "انشائیہ اُردو ادب میں" تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اس لیے مزید کچھ کہنا تکرار کا باعث ہوگا۔ ہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ بعض لوگوں نے مثلاً ڈاکٹر جاوید وششٹ صاحب نے" انشائیہ کو اُردو کی صنف شمار کیا ہے اور ملّا وجہی کو اس کا موجد یا باوا آدم قرار دیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی میں یہ پودا مغرب سے گملے میں در آمد کیا گیا تھا۔ ماسٹر رام چندر اور سر سید احمد خاں نے اپنے مضامین کو انگریزی ایسے کے متبادل کے طور پر پیش کیا لیکن وہ پرسنل ایسے کے مزاج پر پوری قدرت حاصل نہ کر سکے۔ اُردو میں پرسنل ایسے کو انشائیہ کے اصطلاحی نام سے وسیع پیمانے پر وزیر آغا نے ہی متعارف کرایا ہے۔ اس کی ادبی بوطیقا مرتّب کی۔ انشائیوں کی تین کتابیں" خیال پارے "،" چوری سے یاری تک" اور" دوسرا کنارا" پیش کیں متعدد ادیبوں کو انشائیہ کی پہچان کا سلیقہ عطا کیا۔ اتنی خدمات اس صنف کے باب میں اور کس ادیب نے سر انجام دی ہیں؟ انشائیہ کا فروغ ان کے نام کے ساتھ اس طرح منسلک ہو چکا ہے کہ لوگ اب انھیں کو موجد بھی قرار دیتے ہیں اور اس بات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے جو انھوں نے انشائیہ کا موجد نہ ہونے کے بارے میں کہی یا لکھی ہے۔ وزیر آغا سے ایک مخصوص مزاج کا انشائیہ پیدا ہوا۔ اس سلسلۂ فن میں کئی نئے لکھنے والے انشائیہ نگار پیدا ہوگئے اس لیے وزیر آغا صاحب سلسلہ انشائیہ نگار ہیں، انھوں نے اس صنف کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کیا ہے۔ اس لیے میں انھیں انشائیہ کا یعنی وہ پرسنل ایسے جسے اب ہم انشائیہ کہتے ہیں بانی تصوّر کرتا ہوں اور اس سے کسی کا استحقاق مجروح نہیں ہوتا۔ مغرب سے لائے ہوئے اس پودے کی جڑیں وزیر آغا نے مٹی

میں اناری ہیں۔ ان کی اس خدمت کا اعتراف سکالسٹک نقاد سلیم اختر نے بھی کیا ہے جو پہلے انشائیہ کے زبردست حامی تھے اور اب زبردست مخالف ہیں۔ یہ بات مشکور حسین یاد بھی مانتے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنا پہلا انشائیہ تیسری جماعت میں لکھا تھا۔"

حسن رضوی : انشائیہ نگاری کے بارے میں کچھ ناقدین کی رائے ہے کہ اس کے اصل موجد مشکور حسین یاد ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

انور سدید : یہ مشکوک بات جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے مشکور حسین یاد کے مزاح پاروں کی کتاب "جوہر اندیشہ" کے دیباچہ میں کہی تھی لیکن اب حال ہی میں قاسمی صاحب نے کشور ناہید کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ وہ نقاد نہیں ہیں اور دیباچہ نگاری اور فلیپ نگاری تو وہ محض خیر سگالی کے لیے کرتے ہیں، اس لیے انشائیہ اور مشکور حسین یاد کے بارے میں بھی ان کی رائے خیر سگالی کا عمل ہے۔ قاسمی صاحب نے کبھی اس کی صحت پر اصرار نہیں کیا۔ اس رائے کو یاد صاحب نے خوبصورت دوپٹے کی طرح اوڑھ رکھا ہے اور مشکور حسین یاد صاحب اگر خود بھی اپنے آپ کو انشائیہ کا موجد مانتے ہیں تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو انشائیہ نگار ہی کہا ہے نبی تو نہیں کہا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ خود انشائیہ کے فروغ میں سنجیدہ نظر نہیں آتے۔ ان کے اسلوب میں ابھی تک ایک بھی انشائیہ نگار پیدا نہیں ہوا۔ یعنی یاد صاحب ابھی تک بے اولاد ہیں۔ ویسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قاسمی صاحب نے یہ رائے بغضِ معاویہ کے طور پر دی ہے اور اس میں حبِ علی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے "چوری سے یاری تک" کے دیباچے میں لکھا تھا کہ

"اگر کہا جائے کہ اُردو ادب میں وہ (وزیر آغا) اس صنفِ ادب (ایسے) کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہ ہوگا۔"

قاسمی صاحب نے اس رائے کو طویل عرصے کے بعد مشکور حسین یاد پر چسپاں کر دیا لیکن اس کا ثبوت فراہم نہیں کیا۔ دراصل لاہور میں ان دنوں ایک رویہ

عام ہے کہ اُبھرتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں پر صحت مند تنقید کرنے کے بجائے انھیں ملک الشعرا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ کمزور بلکہ اکثر اوقات اغلاط سے پُر اشعار پر بے تحاشا داد دی جاتی ہے اور یوں اس کے ارتقائے فن میں رکاوٹ ڈال دی جاتی ہے۔ یا د صاحب کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ہاں انشائیہ کا جوہر نکھر نہ سکا۔ اور انھوں نے رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں اور محمد خالد اختر جیسے مزاح نگاروں کی صف میں بیٹھنا پسند نہ کیا۔"

حسن رضوی: معاف کیجئے بات ذاتیات کی طرف نکل گئی ہے۔ سلمان بٹ کے سلسلے میں آپ کا رویّہ بھی تو کچھ ایسا ہی تھا، پہلے تو آپ اسے "اون" کرتے تھے لیکن جب ان کی کتاب شائع ہوئی تو آپ کا تاثر مختلف تھا۔

انور سدید: "میرا خیال ہے کہ آپ کو سلمان بٹ مرحوم کے بارے میں پوری معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ سلمان بٹ انشائیہ کے نووارد تھے۔ وہ طنز و مزاح سے آہستہ آہستہ نکل کر شگفتہ انشائیہ نگاری کی طرف آ رہے تھے کہ انھیں موت نے ہم سے چھین لیا۔ "بدصورتی" اور "جمعہ" ان کے دو اچھے انشائیے ہیں اور اس کا اعتراف میں نے ہمیشہ کیا ہے۔ ان کی باقی تحریروں پر طنز و مزاح غالب ہے۔ اور قاری کو ہنسانے کی شعوری کوشش بھی کرتے ہیں۔ رہ گئی ان کی کتاب "سفید بال" کی بات تو برادرم حسن رضوی، یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی اور اس کی تقریب رونمائی میں یہ ناچیز بھی شریک تھا۔ صدارت وزیر آغا صاحب نے کی تھی اور ان کی انشائیہ نگاری پر مقالہ صابر لودھی صاحب نے پڑھا تھا۔ لیکن کتاب کے دیباچہ نویس اور فلیپ نگار اس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ اور اپنے لکھے ہوئے کا دفاع ہی نہیں کیا۔

ادب میں شخصیات کو "اون" یا "ڈس اون" کرنا بالکل بے معنی ہے۔ ادب میں اوّلین حوالہ "تخلیق" ہے۔ تخلیق کار تو بعد میں رونما ہوتا ہے اور تخلیق کے وسیلے سے ہی اپنا تشخص قائم کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اب یہ رواج

عام ہوگیا ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لکھنے والا کون ہے؟ اگر ادیب ان کا حلقہ بگوش ہے تو سبحان اللہ اور اگر حزب اختلاف میں شامل ہے تو اعلیٰ پائے کی تخلیق بھی بیک نگاہ مسترد کردی جاتی ہے۔ چنانچہ "کیا لکھا ہے؟" کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے ادبا اشتہاری شہرت کی چاندنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ رویہ ایک خاص مقصد کے تحت فروغ دیا جارہا ہے۔ مقصد ادب اور تخلیق کے بجائے ادیب کی ذات کی تزئین و تجلیل ہے۔ لیکن جب کسی عظیم شخصیت کے نمائشی ماؤنٹ ایورسٹ سے چوہا بھی برآمد نہیں ہوتا اور مہارشی کے پردے سے راسپوٹین نکل آتا ہے تو ادب کا بیڑا اس کے ساتھ ہی غرق ہوجاتا ہے۔ معصوم قاری کا ادب سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔"

حسن رضوی: انور سدید صاحب! دیکھ لیجئے کہ آپ کھلی کچہری میں بہت شدید الزام عائد کر رہے ہیں۔ ادبی دنیا اور ادیبوں پر۔ آپ شاید اسے ثبوت فراہم نہ کرسکیں۔

انور سدید: "محترم! یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو اب کسی ثبوت کی محتاج نہیں، آپ اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائیں۔ کئی عظیم لوگوں سے آپ کی ملاقات ہوجائیگی جو اپنے گلے میں ڈھول لٹکائے خود اپنے نام کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔ اس قسم کے کئی لوگوں کو تو خود آپ نے اپنے اخبار میں عُریاں کیا ہے۔ آپ کو ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟"

حسن رضوی: آئیے اب پھر انشائیے کی طرف۔ وزیر آغا نے انشائیہ کی جس انداز میں تعریف کی ہے بعض نقاد اسے مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔

انور سدید: اس سے بھی مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس قسم کے نقاد تاحال انشائیہ کی تعریف وضع ہی نہیں کرسکے۔ نہ کبھی انہوں نے خود انشائیہ لکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انشائیہ کی پہچان ہی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس وزیر آغا کی وضع کردہ تعریف کو نہ صرف قبول کرلیا گیا بلکہ اب اُردو انشائیے کا تجزیہ بھی اسی تعریف کے مدار میں کیا جارہا ہے۔ اس تعریف کی اساس پر ہی انشائیہ کی بنیاد مضبوط ہورہی ہے۔ اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اصناف اور اصطلاحاتِ ادب کی جامد تعریف ناقص سمجھی جاتی ہے۔ صنفِ ادب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کی

تعریف میں بھی مناسب تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کیا غزل کی وہ تعریف اب قابل قبول ہے جو ولی دکنی کے زمانے میں مروّج تھی؟

حسن رضوی: کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ صرف ایسے ادیبوں کو انشائیہ نگار مانتے ہیں جن کا تعلق آپ کے حلقے سے ہے اور اس طرح آپ ادب میں خویش پروری اور اور اقربا نوازی کے مرتکب ہیں؟

انور سدید: "حسن رضوی صاحب کسی کو ماننے یا نہ ماننے کے بارے میں آپ نے میری رائے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ بھائی! میں کیا اور میری رائے کیا! رہ گئی حلقۂ احباب کی بات تو واضح کر دوں کہ میں نے تخلیق کار کے بجائے تخلیق کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اپنی پسند کی اساس فن پارے کی جمالیات کو دی ہے۔ اس کو دلیل سے استحکام دینے کی کوشش کی ہے۔ جن ادیبوں کے بارے میں مجھے لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اگر آپ ان سب کو میرے حلقۂ احباب میں شامل تصور کرتے ہیں تو مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان اور کون ہوگا؟ میں نے تو احمد ندیم قاسمی صاحب کی بعض فن پاروں کی بھی کھل کر داد دی ہے حالانکہ یہ ناچیز ان کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ آدمی شمار کیا جاتا ہے۔ میں نے عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، مشکور حسین یاد، فتح محمد ملک، محسن بھوپالی، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، طاہر تونسوی، یوسف حسن، ضیا بٹ، نجیب احمد، ناہید قاسمی، شبنم شکیل، منصورہ احمد، محمد خالد اختر، محمد کاظم، اختر حسین جعفری اور متعدد دوسرے پاکستانی ادیبوں پر لکھا ہے اور جہاں خوبی نظر آئی ان کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ ان سے کسی محفل میں ملاقات ہو جائے تو وہ ہاتھ ملانے سے قبل گرد و پیش میں دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی گستاپو تو موجود نہیں۔ اگر یہ خویش پروری اور اقربا نوازی ہے تو میں اعترافِ جرم کرتا ہوں۔ سرِ تسلیم آپ کے سامنے خم کرتا ہوں۔"

حسن رضوی: ڈاکٹر صاحب! آپ نے ایک ہی سانس میں بہت سے نام گنوا دیے دوسروں کو چھوڑیے مجھے صرف یہ بتائیے کہ آپ نے ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کے فن کا اعتراف کہاں کیا ہے؟

انور سدید: حسن رضوی صاحب ہیں تو ڈاکٹر طاہر تونسوی کو بہت بڑا فن کار تسلیم کرتا ہوں اتنا بڑا فن کار تونسہ نے پیدا نہیں کیا۔ فکر تونسوی اور سرور تونسوی صاحب تو ان کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر بھی نہیں۔ یہ دونوں نرے ادیب ہیں یا سچے اور خالص انسان۔ رہا ان کے اعتراف کا مسئلہ تو دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا ناچیز مضمون "دلاورانہ سرقے کی ایک مثال" ملاحظہ فرما لیجئے۔ یہ ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب کے فن کے اعتراف ہی میں لکھا گیا ہے۔"

حسن رضوی: اچھا چھوڑیئے اس بات کو یہ بتایئے کہ انشائیہ کا ادب میں مستقبل کیا ہے؟

انور سدید: برادرم، کسی صنفِ ادب کے مستقبل کا تعلق اس صنف کے تازہ واردان اور نئے لکھنے والوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ نیا خون جب تک فراہم ہوتا رہے گا۔ صنفِ ادب روز افزوں ترقی کرتی رہے گی۔ انشائیہ کو نئے لکھنے والے بھی ملے ہیں اور نئے موضوعات بھی میسر آئے ہیں۔ کتاب "انشائیہ اُردو ادب میں" کے بعد کے دور کا جائزہ لیں تو آپ کو نئے انشائیہ نگاروں کی پوری ایک کھیپ نظر آئے گی۔ ان میں شہزاد احمد، ارشد میر، اکبر حمیدی، جوگندر پال، صابر لودھی، محمد منشا یاد، غلام الثقلین نقوی، ڈاکٹر بشیر سیفی، حیدر قریشی، انجم نیازی جیسے ممتاز ادبا بھی شامل ہیں اور امجد طفیل، حامد برگی، فاروق ندیم، علی اختر، قمر اقبال، رعنا تقی، اقبال انجم، شعیبہ خان، فرح سعید رضوی، راجہ ریاض الرحمٰن، محمد اسد اللہ، جان کاشمیری، محمد اسلام تبسم، رشید گوریجہ، ناصر رانا، رضی الدین رضی، انور جمال، شاکر علی شاکر، اظہر ادیب، خیرالدین انصاری جیسے نسبتاً نوواردان ادبا بھی شریک ہیں۔ انشائیوں کے متعدد مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ انشائیے کی تنقید پر کم از کم تین کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ حال ہی میں ڈاکٹر بشیر سیفی نے "کتابیاتِ انشائیہ" اوراق میں پیش کی ہے اس سب کو پیشِ نظر رکھیئے تو انشائیہ کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے انشائیہ کی پہچان کا مسئلہ بھی اب طے پاتا جا رہا ہے۔ متعدد رسائل نے انشائیہ نمبر شائع کئے ہیں۔ حال ہی میں دو انشائیہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔

مجھے تو اس صنف کے سماجی حالات حوصلہ افزا نظر آتے ہیں۔"

حسن رضوی: ڈاکٹر صاحب! ایک بات اور پوچھ لینا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ آپ نے آج تک اپنے دفاع میں اتنا کچھ نہیں لکھا جتنا ڈاکٹر وزیر آغا کے دفاع میں اور شاید اسی وجہ سے کچھ لوگوں نے آپ کو ڈاکٹر وزیر آغا کے مزارع کا خطاب بھی دیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا پر کی گئی تنقید کا ہمیشہ آپ ہی جواب دیتے ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب خاموش رہتے ہیں۔

انور سدید: "حسن رضوی صاحب! مجھے وزیر آغا صاحب کے قریب رہنے کا اعزاز یقیناً حاصل ہے لیکن میں نے ان کا دفاع کرنے کی بجائے ہمیشہ ادب کا دفاع کیا ہے۔ میں نے بالعموم "کیا کہا گیا ہے"؟ کو موضوع بنایا ہے اور بحث کو موضوع کے مدار میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بحث میں "جس کے بارے میں کہا گیا ہے" اس کا ذکر بھی آئے گا اور "جس نے کہا ہے" اس کے نام کی تکرار بھی ہو گی۔ ردِ عمل کے اس قسم کے مضامین صرف وزیر آغا تک محدود نہیں بلکہ ان کا دائرہ وسیع ہے۔ میں نے ادب کے متذکرہ دفاع میں مختار مسعود کے خلاف فتح محمد ملک کی تنقید، رام لعل کے خلاف وارث علوی کی تنقید۔ نظیر صدیقی کے خلاف عبداللہ جاوید کی تنقید کا جواب بھی لکھا ہے۔ میری مخالفت تو شخصیات سے نہیں غلط بیانی سے ہے اور یہ مجھے جہاں بھی نظر آتی ہے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ آپ اسے میری "بدعادت" شمار کر لیں۔ وزیر آغا کے خلاف چونکہ زیادہ غلط بیانیاں ہوئی ہیں اس لیے میں نے ان پر زیادہ لکھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کسی نے احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری کے بارے میں کوئی غلط بیانی کی تو میں اس کا جواب بھی ضرور لکھوں گا۔ جبکہ مجھے یقین ہے کہ ان ادبا کے حلقہ بگوش "منقار زیر پر" رہنا ہی پسند کریں گے۔

ادیب کی بنیادی وابستگی یا کمٹ منٹ ادب کے ساتھ ہے۔ شخصیات کے ساتھ اس کی وابستگی ثانوی نوعیت کی ہے۔ ادب کی اقدار انسانی اقدار سے قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر شدید اختلاف اور ذہنی

عدم آہنگی کے باوجود جب کبھی قاسمی صاحب شومئی قسمت سے بیمار پڑ جاتے ہیں یا گردے اور مثانے کے کسی آپریشن سے گزرتے ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اور میں ان کے دُکھ میں، ان کے غم میں شریک ہونے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ میں نے ان کے ہر ذاتی سانحہ پر اپنے کرب کا اظہار خط لکھ کر کیا ہے لیکن کسی خط کا جواب کبھی نہیں آیا۔ نہ میں نے کبھی توقع کی ہے۔ "فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست" والی بات تصوّر کر لیجئے۔

رضوی صاحب، ایک مخصوص طبقے نے وزیر آغا سے میری قربت کو غلط رنگ دیا ہے۔ مجھے ان کا مزارع کہہ کر میرے خلوص کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔ بادی النظر میں مزارع مالک کی زمینوں کو حریص نظروں سے دیکھتا ہے، ان پر قابض ہونے کے لیے سازشیں کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر مالک کے دشمنوں سے بھی مل جاتا ہے۔ موقع مل جاتے تو اسے قتل کرنے یا بہتر معاوضے پر نئے مالک کا غلام بننے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ میں نے مزارع کی یہ توضیح اس وقت کی تھی جب مجھ پر یہ پھبتی کسی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ پھبتی کسنے والے اس تعریف کے آئینے میں خود کو دیکھیں اور اپنی عقلِ سلیم سے اپنے کردار کا تجزیہ کریں اور پھر اگر مناسب سمجھیں تو میرا تجزیہ بھی کر ڈالیں میری پشت پر بھی تو میرے ساٹھ سال کے افعال و اعمال کا پشتارہ رکھا ہوا ہے۔

وزیر آغا کا کسی سرکاری منفعت بخش ادارے سے تعلق نہیں ہے۔ وہ کسی فائدہ پرست کو سرکاری خزانے سے مالی منفعت فراہم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ان کی محفل میں محرومین کے بجائے مالی اعتبار سے مطمئن اور آسودہ، سماجی اعتبار سے باوقار اور با مقام اور علمی لحاظ سے اہلِ علم اور اہلِ ذوق اصحاب شریک ہوتے ہیں، ان کی قربت میں مالی منفعت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ خود مجھے اللہ تعالےٰ نے میری استعداد سے زیادہ نواز رکھا ہے اور میں مالی اعتبار سے کسی کی مدد نہیں کر سکتا تو کسی کا محتاج بھی نہیں ہوں۔ ہاں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میں جب محکمہ آبپاشی کی ملازمت میں ادب کے فریضے سے غافل ہو چکا تھا تو وزیر آغا ہی مجھے دوبارہ ادبی دُنیا میں کھینچ لائے۔ انھوں نے ادب کے ذوق کو عشق میں تبدیل کر دیا۔ آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جو لوگ مخصوص

مقاصد لے کر وزیر آغا کے قریب آتے ہیں وہ جلدی ہی بھاگ جاتے ہیں اور بعض مومن تو دوسری دفعہ ڈسے جانے کے لیے پرانے سوراخ میں بھی انگلی ڈال دیتے ہیں۔ وزیر آغا سے میرا تعلق غیر افادی اور علمی نوعیّت کا ہے۔ مجھ پر پھبتیاں اس لیے کسی جاتی ہیں کہ یہ تعلق کسی طرح ٹوٹ جائے۔ چنانچہ کئی دفعہ کہا گیا کہ "انور سدید کا قد وزیر آغا سے بلند ہے" - (سبحان اللہ) "انور سدید اپنی شخصیت کو خود نقصان پہنچا رہا ہے" (نظرِ بد دُور) "انور سدید تنقید میں بہت اونچا جا رہا ہے - وزیر آغا کی صحبت خراب کر رہی ہے" (ماشاء اللہ) میں اس قسم کی باتیں سنتا ہوں لیکن اثر قبول نہیں کرتا۔ ادب کا طالب علم رہنے میں اور تشنگی برقرار رکھنے میں جو مزا ہے وہ "علاّمہ" بننے میں یا استاد کہلانے میں نہیں۔ میں تو معمولی قاری ہوں ادب کا اور اپنے مقام کو پہچانتا ہوں۔ دوسری طرف آپ جانتے ہوں گے کہ بعض بڑے لوگ اپنی شہرت کے گراف کو قائم رکھنے یا بلند کرنے کے لیے کس طرح قومی سرکاری اداروں کا روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ ایک طبقہ مراعات حاصل کرنے کے لیے سی ایس ایس افسروں کی کاسہ لیسی میں مصروف ہے۔ میں اس ڈرامے کا تماشائی ہوں اور کٹھ پتلیوں کا تماشہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ اب رہ گئی یہ بات کہ وزیر آغا اپنے خلاف لکھے گئے مضامین کا خود کیوں جواب نہیں دیتے؟ آپ کو یہ سوال وزیر آغا سے کرنا چاہئے۔ آپ کے لیے یہ اطلاع شاید حیرت انگیز ہو کہ وزیر آغا اپنے خلاف لکھے گئے دشنام کے پشتاروں کو پڑھتے ہی نہیں لیکن مجھے یہ سب کچھ پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے اور جواب لکھ کر بھی میں عجیب سا انبساط و سرور حاصل کرتا ہوں۔ شاید یہ میرے راجپوتی خون کا اثر ہے کہ کسی دوست کے محاذ پر لڑنا مجھے عین سعادت نظر آتا ہے۔ یہ لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی ہے۔ اس سے میرا کتھارسس ہو جاتا ہے۔ نہ لکھوں تو شاید بیمار پڑ جاؤں۔ ادبی جنگ جتنی لمبی ہو جائے مجھے اتنی ہی پُرلطف محسوس ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ

"خدا کرے کہ رقیبوں کا انتقال نہ ہو!

خدا انہیں عمرِ خضر عطا کرے"

حسن رضوی: "ایک معمّر اور بزرگ ادیب کے ایک مجلّے کے خلاف "اُردو زبان" میں کئی

مہینوں تک شائع ہونے والا ردِ عمل ادب کی کون سی خدمت ہے؟ آخر "درگزر" بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے؟

انور سدید: "حسن رضوی صاحب۔ یہ تو عوام کی آواز ہے اور یہ کسی ادیب کے خلاف نہیں بلکہ دشنام طرازی کے اس رویے کے خلاف ہے جو متذکرہ اظہار سے سطح پر آ گیا ہے۔ ورنہ زیرِ سطح تو یہ رویہ گزشتہ نصف صدی سے فروغ پا رہا تھا۔ ماہ نامہ "اردو زبان" تو حق گوئی کا دفاع کر رہا ہے۔ ادب کے آمروں کے سامنے کلمۂ حق کہہ رہا ہے۔ ادب کی حرمت کو بحال کر رہا ہے۔ اصلاح کی صورت پیدا ہوئی تو یہ ردِ عمل بھی ختم ہو جائے گا۔ بھائی، بزرگ ادیبوں کو اپنی خطا کا احساس نہیں ہو گا تو ادبی معاشرے کی صورتِ حال کیوں خراب نہیں ہو گی۔ عام لوگ تو ادیب کو مثالی انسان تصوّر کرتے ہیں اور ان کے لکھے ہوئے سے اپنی زندگی سنوارتے ہیں۔ ادیب کو انسانیت کا کم سے کم معیار تو رکھنا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ساٹھ پینسٹھ یا ستّر کا سن تجاوز کر جانے والے ادبا اپنے غیر ادبی رویّے پر نظرِ ثانی فرمائیں اور جونیئر ادیبوں کو شودر تصوّر نہ کریں۔"

حسن رضوی: "کیا صحت مند ادب کی تخلیق کے لیے موجودہ دور میں گروہ بندی ضروری ہے؟ اور کیا "سرگودھا سکول آف تھاٹ" کا وجود اسی گروہ بندی کا نتیجہ ہے؟"

انور سدید: "صحت مند ادب کی تخلیق تو اس آتش فشاں سے ہوتی ہے جو ادیب اپنے اندر سلگا رکھا ہے اور اس کی آنچ اسے مسلسل اظہار پہ مائل کرتی رہتی ہے۔ گروہ بندی کا تعلق تخلیقِ ادب سے نہیں بلکہ ادبی معاشرے سے ہے۔ ہر ادبی گروہ اپنے مخصوص مقاصد کا اسیر ہوتا ہے اور ان مقاصد ہی سے اس کا مثبت یا منفی رویہ متعین ہوتا ہے۔ گروہ اگر شخصی نمائش، تحسینِ بے جا اور تجلیلِ ذات کے لیے کوشاں ہو اور جوڑ توڑ، سازش، منصوبہ بندی، دروغ، دشنام اور کردار کشی کے حربے استعمال کرنے لگے تو ادب اور ادیب دونوں کو نقصان ضرور پہنچے گا اور اس سے شاید ادیب کا فطری ارتقا بھی رک جائے۔ دوسری طرف اگر کوئی گروہ ادیب کے داخل میں تخلیقی شعلے کو فروزاں رکھتا ہے۔ علمی سطح کو بلند کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ نئے مباحث، نئی کتابوں اور مصنّفوں سے متعارف کراتا ہے، اخلاقی

باتوں کو سننے اور صداقت کو قبول کرنے کی تربیت دیتا ہے تو اس قسم کا گروہ ادب کے لیے نعمت ہے جسے "سرگودھا سکول آف تھاٹ" کہا گیا ہے وہ مؤخر الذکر رویّے کو فروغ دینے میں ہی کوشاں ہے اور اس کا سلسلۂ نسب وزیر آغا کے حوالے سے مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دُنیا کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔"

حسن رضوی: آپ اپنے مخالفین کی تنقید کے جواب میں فارقلیط، قلم بردار، زود اندیش، میرزا غالب، ابن السّبیل، ہوتل بابا، ابنِ قلم - ڈاکٹر ی۔ لائنس اور نہ جانے کتنے قلمی ناموں سے لکھتے ہیں۔ کیا یہ قلمی نام کسی خود ساختہ قلمی خوف کا نتیجہ ہیں؟

انور سدید: "بھائی حسن رضوی! آپ نے اتنے نام گنوا دیئے ہیں کہ اب میں خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں کس نام سے لکھنے کا گنہگار نہیں ہوا۔ میں لکھنے والوں کی زبان تو نہیں پکڑ سکتا لیکن یہ تو پوچھ سکتا ہوں کہ اتنے ناموں سے اور اس کثرت سے لکھنا میرے لیے کریڈٹ ہے یا ڈِس کریڈٹ۔ کچھ لوگوں کو تو میں نے یہ کہتے بھی سنا ہے کہ کالم "حرف و حکایت"۔ "لاہور لاہور ہے"۔ "رواں دواں"۔ "سخن در سخن"، "روزنِ دیوار سے" "چشمِ تماشا" اور "اندیشۂ شہر" وغیرہ بھی میں ہی لکھتا ہوں۔ ایسے کہہ پر لاحول ولا پڑھیے۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے لکھنا ہی نہیں آتا اور یہ سب کچھ مجھے وزیر آغا لکھ کر دیتے ہیں — آپ اس کی داد دیجئے"!

البتہ خود ساختہ خوف والا مفروضہ غلط ہے۔ میں نے نقطۂ اعتراض اٹھاتے وقت دستاویزی ثبوت فراہم کیا ہے۔ ڈرائنگ روم کی گپ شپ اور دوستوں کی محفل میں اڑنے والی باتوں کے پُرزے کبھی نہیں پکڑے۔ لوگوں کو چونکہ سچ سننے اور تنقید برداشت کرنے کی عادت نہیں ہے اس لیے وہ تلملاتے ہیں اور پھر مجھ پر برسنے لگتے ہیں، کردار کشی کرتے ہیں۔ حسن رضوی۔ میں اپنے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اس کا دفاع بھی خود کر سکتا ہوں۔ خوف کس بات کا؟ خوف تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی نے عظمت کا نقاب اوڑھ رکھا ہو اور

سابقہ محرومیوں کا انتقام ن۔م۔ راشد کے طریق سے لینے میں مصروف ہو۔ خود ساختہ عظمت کا تصوّر خوف پیدا کرتا ہے کہ یہ بلبلہ کہیں سرِ محفل ٹوٹ نہ جائے۔ میں تو گھسان میں رہ کر زندگی کا مزہ لوٹتا ہوں دھکّے کھا کر ہجوم میں رہنا پسند کرتا ہوں اونچا اڑنا مجھے پسند نہیں۔ میں نے زمین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ایک روز اسی میں گم ہو جانے کا آرزومند ہوں۔

اور ہاں یہ تو بتائیے کہ کیا قلمی نام سے لکھنا جرم ہے؟ سندباد جہازی، پنج دریا، عنقا، غریبِ شہر، خامہ بگوش، ڈاکٹر حجازی، فتّو لوہار، کیا قلمی نام نہیں ہیں۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کیا لکھا گیا ہے؟ ملاحظہ کیجئے۔ اس بات کو ثانوی حیثیت دیجئے کہ کس نے لکھا ہے؟"

حسن رضوی: کیا تنقیدی عمل کے لیے کسی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت بھی ہوتی ہے؟

انور سدید: "ضابطۂ اخلاق تو ہر عمل کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس دور میں ہر ادیب نے اپنا ضابطۂ اخلاق الگ وضع کر رکھا ہے اور یہ مختلف النّوع لفظیات اور اصطلاحات و معانی کے تابع ہے۔ مثلاً ہمارے ایک نقاد ہر قسم کی بداخلاقی کو اس سلیم الطبعی سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ ان کا ضابطۂ اخلاق نظر آتا ہے۔ ہمارے محترم وارث علوی صاحب کے ہاں دشنام عینِ اخلاق ہے۔ پھر ادبا کا ضابطۂ اخلاق بھی ہمہ وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ دوست کے لیے الگ، رسالہ کے مدیر کے لیے الگ، کتاب کے ناشر کے لیے، ادبی مخالفوں کے لیے الگ، ہمارے بعض فائدہ پرست نقّاد تو ناشر کی ابرو کے اشارے پر مثبت کو منفی اور منفی کو مثبت بنا ڈالتے ہیں۔"

حسن رضوی: کیا آپ تنقید کو تخلیق سمجھتے ہیں؟

انور سدید: دیکھئے صاحب! تخلیق کے مقابلے میں تنقید ثانوی درجے کا شعوری عمل ہے۔ تنقید تخلیق کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ البتہ نقاد اگر تخلیقی ذہن کا مالک ہے اور وہ تنقید میں تخلیقی عمل سے بھی گزرتا ہے اور فن پارے کے بطون سے معنی کی بازیافت تخلیقی انداز میں کرتا ہے تو میں اسے بلند مرتبہ نقّاد تصوّر کرتا ہوں، اس کی نکتہ آفرینی تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ نارتھ روپ فرائی نے

نقاد کی تخلیقیت کا اعتراف کیا ہے اور اسے تخلیق کار کا درجہ دیا ہے"۔
حسن رضوی: ہمارے ہاں لکھی جانے والی تنقید کس حد تک نظریات کا احاطہ کرتی ہے اور کس حد تک ذاتیات کا؟
انور سدید: "معاف کیجئے آپ کا یہ سوال واضح نہیں ہے۔ تنقیدی نظریہ تو وہ سانچہ ہے جس میں تخلیق کے حسن و قبح کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کی جمالیات دریافت کی جاتی ہے، معنی کی بازیافت کی جاتی ہے۔ چنانچہ مارکسی تنقید کا سانچہ الگ ہے، نفسیاتی تنقید کا طریق مختلف ہے۔ اسی طرح رومانی تنقید، اخلاقی تنقید، تاثراتی تنقید کے سانچے الگ ہیں۔ نارتھ روپ فرائی نے آرکی ٹائپل، ریٹرک، علامتی اور اسطوری تنقید کے الگ اصول وضع کیے ہیں اور ان میں سے بیشتر تو ہمارے ادب میں مستعمل ہی نہیں ہیں۔ سٹرکچرل تنقید نے نیا سانچہ پیش کر دیا ہے۔ میرے خیال میں ذاتیات سے مراد وہ تنقید ہے جو کتابوں کی رونمائی کی تقریبات میں پروان چڑھ رہی ہے۔ اس میں تحسین کی آمیزش زیادہ ہے۔ یہ تنقید نہیں تقریظ ہے جو ادیب کو تھوڑی دیر کے لیے آسمان پر بٹھا دیتی ہے۔ اس سے ادب اور تنقید کے علاوہ ادیب کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ ایک محفل میں ایک مقرر نے صاحبِ تصنیف کو ایلیٹ، آرتھر کوئسلر، کافکا، کامیو اور فریزر سے بھی بڑا اور عہد ساز ادیب قرار دیا۔ تقریب ختم ہوئی تو صاحبِ کتاب ناراض تھے کہ مقرر نے انہیں کن واہیات لوگوں کے ساتھ بریکٹ کیا ہے۔ حالانکہ وہ سرسید، حالی، اقبال اور غالب کے پائے کے ادیب ہیں۔ اس قسم کے لطیفے تقریباتی تنقید میں اکثر ہوتے ہیں"۔
حسن رضوی: اچھا تو آپ اپنے انہیں خیالات کی روشنی میں یہ فرمائیں کہ ایسے کون سے نقاد ہیں جو صحیح معنوں میں تنقید لکھ رہے ہیں۔
انور سدید: "بیشتر وہ نقاد جو تقریبات میں مضامین نہیں پڑھتے اور دوست نوازی کو ادب کی قدر شمار نہیں کرتے۔ لیکن ہمارے ہاں تو متفرق نویسی کا چلن زیادہ ہے۔ بہت سے تنقیدی مضامین مدیرانِ رسائل کی فرمائش پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی موضوع پر مربوط انداز میں سوچنے اور پوری کتاب لکھنے کا رجحان

تقویت نہیں پکڑ سکا۔ شمس الرحمٰن فاروقی بہت اچھے نقّاد ہیں لیکن یک موضوعی کتاب انھوں نے بھی نہیں لکھی۔ محمد عسکری کے مزاج کو سلیم احمد نے قبول کر لیا تھا لیکن وہ بہت جلد موت کی نذر ہو گئے۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر وحید اختر سہیل احمد خاں، کرامت علی کرامت، محمود ہاشمی، مشتاق قمر، بلراج کومل نے کم لکھا ہے لیکن ان کے ہاں مطالعے کی اساس پر فن پارے کا جوہر دریافت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وزیر آغا ان سب سے الگ ہیں۔ انھوں نے موضوعات پر مبسوط انداز پر سوچا اور نظریہ سازی کی، مستقل نوعیت کی کتابیں "اُردو شاعری کا مزاج" "تخلیقی عمل"، "نظمِ جدید کی کروٹیں" وغیرہ لکھیں۔ لیکن ہماری تنقید مجموعی طور پر مغربی تنقید سے بہت پیچھے ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ تنقیدی نظریات مغرب سے درآمد شدہ ہیں اور انھیں ادبیاتِ مشرق پر عملی تنقید میں استعمال کیا جا رہا ہے۔"

حسن رضوی: ہمارے ہاں تنقیدی زاویۂ نگاہ قائم کرتے وقت مغربی ناقدین کا حوالہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری، شمس الرحمٰن فاروقی، سلیم احمد، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وزیر آغا، کلیم الدین احمد، باقر مہدی، فضیل جعفری، وارث علوی، احتشام حسین اور اسی طرح کے دوسرے ناقدین کے قد و قامت کا تعین کس طرح کریں گے؟

انور سدید: مغرب سے استفادے کی بات تو میں نے ابھی عرض کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علومِ نو کا سیلاب مغرب ہی سے آ رہا ہے۔ اسی لیے مغربی مصنفین کے حوالے زیادہ آتے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ بعض نقّادوں نے مغربی مفکروں کے ناموں سے مرعوب کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ جن کا مطالعہ یا تو نامکمل ہے یا غیر ہضم شدہ ہے۔ اب رہی قد و قامت کی بات تو آپ نے جتنے نام لیے ہیں یہ سب بڑے نام ہیں تنقید کے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ کلیم الدین احمد نے مغربی پیمانوں پر مشرقی ادب کو جانچا تو انتہا پسندانہ رویّہ پیدا ہوا اور ان کے دو ایک جملوں پر تو اب تک گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے۔ باقر مہدی کا مغربی ادب کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور وہ جب کوئی حوالہ دیتے

ہیں تو متاثر نہیں کرتے۔ وہ مجھے بہت جھلّائے ہوئے برہم سے نقّاد لگتے ہیں۔ وارث علوی نظریہ سازی اچھی کرتے ہیں لیکن عملی تنقید میں دشنام کو انہدام کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ پہلے چادرِ دشنام اپنے اوپر نچھاور کرتے ہیں۔ پھر دوسروں پر یلغار کر دیتے ہیں۔ فضیل جعفری کو ہندوستان کا سلیم اختر سمجھیے۔ وہ رائے تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگاتے اور غلیظ زبان بھی استعمال کر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید پہ ان کی تحقیق غالب ہے۔ اب ان کی دو تنقیدی کتابیں چھپ کر آئی ہیں تو وہ تنقیدی تناظر میں بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔ احتشام حسین نے مارکسی نقطہ نظر کو وضع داری سے پیش کیا اور ہر حلقۂ خیال میں پسند کیے گئے۔ حسن رضوی صاحب! آپ نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ وہ ہمارے چند اہم نقّادوں میں سے ہیں، ممتاز شیریں کا نام بھی نہیں لیا جو افسانے کی ایک اہم نقّاد ہیں۔"

حسن رضوی: نام تو میں نے سلیم اختر کا بھی نہیں لیا۔

انور سدید: "ڈاکٹر صاحب زود رنج نقّاد ہیں۔ مطالعے کو ہضم کرنے سے پہلے اگل دیتے ہیں۔ کاتنے سے پہلے دوڑنے لگتے ہیں اور سرپٹ دوڑتے ہیں۔ اس دوڑ میں ان کی انشاء پٹخنیاں کھانے لگتی ہے اور ان کے مطالب کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ان کی تنقید فائدہ پرستی اور مخصوص مقاصد کی ترجمان ہے۔ حسبِ خواہش تعریف نہ ہو تو ناراض ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تو ادبی بددیانتی پر تفاخر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ انمول خوبیاں کسی دوسرے نقّاد میں کم کم نظر آتی ہیں۔ ویسے میں انھیں صاحبِ سلسلہ نقّاد تسلیم کرتا ہوں۔ انھوں نے اپنے بیشتر معائب ڈاکٹر طاہر تونسوی .... کو منتقل کر دیے ہیں ...... جنھیں کوئی بھی ال لیجٹی میٹ "شاگرد" نہیں کہہ سکتا۔"

حسن رضوی: ایک ذاتی بات کی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک کالم نگار نے آپ کو "زبان درازِ سرگودھوی" کا خطاب بھی دیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا اس کے جواب میں آپ نے انھیں "اللہ دتہ کالمی" کے لقب سے نوازا۔ ادب میں اس قسم کے القابات استعمال کرنا کہاں تک مناسب ہے؟"

انور سدید: "میں ایسے تمام خطابات اور القابات جن سے کسی ادیب کی توہین کا پہلو

نکلے نا واجب اور ناجائز تصوّر کرتا ہوں۔ پروفیسر اللہ دتہ کالمی کا کردار اخبار جسارت کے زود اندیش کی اختراع ہے۔ اس سے وہ ادبی معاشرے کی جملہ ناہمواریوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کسی مخصوص شخصیت کا تضحیکی نمایندہ نہیں۔ اگر کوئی صاحب اس میں اپنے اوصاف تلاش کر لیتے ہیں تو یہ خود ان کی "خوش فہمی" یا "عالی ظرفی" ہے۔ ویسے عرض کر دوں کہ بعض لوگ ہر بات کو کھینچ تان کر اس کا رُخ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ میں نے ملک حسن اختر کی کتاب پر تبصرہ کیا اور ان کے بارے میں لکھا کہ "ان کی خوبی صلہ وستائش سے بے نیازی ہے۔ ان کا کام تو ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن وہ خود اخبار کے ادبی کالموں میں نہ چیختے ہیں اور نہ چنگھاڑتے ہیں"۔ اس پر ایک عطائی ادیب نے ملک حسن اختر سے شکایت کی "یہ جملہ انور سدید نے میرے خلاف لکھا ہے"۔ ڈاکٹر اسلم فرخی مجھے بتا رہے تھے کہ انھوں نے اشرف صبوحی صاحب کے بارے میں جب لکھا کہ وہ شریف انسان ہیں لیکن اپنی شرافت کا اعلان ڈھول باجوں سے نہیں کرتے تو ایک عظیم ادیب ناراض ہو گئے کہ اس جملہ میں ان کی شرافت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اُردو میں متعدد مضحک کردار مثلاً خوجی، چچا چھکن، حاجی بغلول، مرزا اینڈ کی، چچا بختیار خلجی وغیرہ مختلف ادیبوں نے وضع کیے ہیں اور ان کے نقوشِ امتیاز حقیقی زندگی سے تلاش کیے ہیں۔ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کا کردار استاد لاغر مرادآبادی، زود اندیش کا مرزا اِدھر علی اُدھر اور اللہ دتہ کالمی بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ آپ نے جس کالم نگار کا ذکر کیا ہے اس نے اپنے نقوش عمل اللہ دتہ کالمی میں دیکھ لیے اور جوابی حملے کے طور پر اس ناچیز کو "زبان دراز سرگودھوی" قرار دے دیا۔ بھائی میں نے تو اس کا ہرگز بُرا نہیں منایا بلکہ اسے کسی دوست کی طرف سے آیا ہوا محبت کا پھول سمجھ لیا ہے اور اپنے کالر میں سجالیا ہے۔ میں نے اس نام سے ماہنامہ اُردو زبان میں متعدد مضامین لکھے ہیں۔ جن کی گونج دُور دُور تک پیدا ہوئی۔ اس عطا کردہ نام میں دشنامی رویّہ اور جمالِ ہم نشیں صاف نظر آتا ہے اور یہ میری زود قلمی کا اعتراف بھی نہیں ہے۔

اور خوشی یہ ہے کہ ...... چلئے چھوڑ یئے اس بات کو .....؟"

حسن رضوی: "آپ کی تحریروں میں اکثر بلکہ بیشتر احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی اور احبابِ "فنون" کو ہر طرح کی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان لوگوں سے آپ لوگوں کے اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ ان سے اختلافات شخصی ہیں یا نظریاتی؟"

انور سدید: "پہلے تو میں یہ عرض کر دوں کہ میرے لیے ادب کی ہر شخصیت محترم شخصیت ہے۔ دوسرے اختلاف کو بعض لوگ اگرچہ پسند نہیں کرتے لیکن ادب میں اختلاف کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کبھی نہیں کیا گیا۔ آپ نے جن لوگوں کے نام گنوائے ہیں یہ سب اختلاف کی اہمیت سے واقف ہیں اور فنون میں انھیں نمایاں جگہ دی جاتی ہے لیکن یہ صرف اصولی بات ہے۔ عملی زندگی میں یہ سب اصحاب دوسروں سے اختلاف کرنے، ان پر تنقید کرنے یا انھیں طنز و تضحیک کا نشانہ بنانے کا حق صرف اپنے لیے محفوظ سمجھتے ہیں، تنقید یا اختلاف کی زد میں ان کی اپنی تخلیق یا ادب آ جائے تو فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اکثر اس ناہنجار پر حقّہ پانی بند کر دیتے ہیں۔ ادبی اختلاف کو ذاتی رنجش کا باعث بنا لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ توصیف و تحسین و تعریف پر تو خوش ہوتے ہیں خواہ یہ مبالغہ آمیز اور حقیقت سے بعید ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن تنقید کی ہلکی سی چبھن بھی برداشت نہیں کرتے۔ ذاتی سطح پر میرے دل میں ان سب کا احترام ہے لیکن ان سے اختلاف کرنا تو میرا حق ہے جس سے میں شاید دست بردار نہ ہو سکوں۔ مجھے بعض لوگوں کے ہاں اختلافِ فکر و نظر واضح نظر آیا۔ شخصیت کے داخل اور خارج میں تضاد دکھائی دیا۔ قول اور فعل میں تفاوت معلوم ہوا۔ میں نے اس کی نشان دہی کی ہے اور اب یہ ناچیز دشنامِ مسلسل کی زد میں ہے اور ایک ادیب نے تو فرمایا ہے کہ میرا نام لینے سے ان کی زبان پلید ہو جاتی ہے۔ میں زبان دراز سر گو دھوی ہوں اس لیے گردن زدنی ہوں۔ یہ عظیم ادیب عظمتِ انسان کے بہت بڑے دعویدار ہیں۔"

حسن رضوی: "ابھی ابھی آپ نے ایک جملے کا حوالہ دیا ہے۔ کیا آپ یہ محسوس

نہیں کرتے کہ ایسا جملہ کسی سے اگ کر ہی کہا جاتا ہے۔ آخر آپ نے بھی تو دشنام طرازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟

انور سدید: "حسن رضوی ہمارے بعض بزرگ ساٹھ ستّر یا شاید اس سے بھی زیادہ لمبے عرصے سے ادب میں سیاست آزما ہیں۔ انھیں کیا ابھی تک ادبی معاشرے کے آداب و رسوم و اخلاقیات سے آگہی نہیں ہوئی۔ ادب کا ایک مفہوم الفاظ کو نظم و ضبط سے استعمال کرنا ہے۔ یہ بزرگ ادیب کیا اس مفہوم سے نا آشنا ہیں؟ متذکرہ بالا جملے سے میری ذات کو نقصان نہیں پہنچا۔ خود ادیبِ محترم کا عظمتِ انسان کا تصور منہدم ہو گیا ہے۔ پوری ادبی برادری کا وقار مجروح ہوا ہے۔ ادب سے عام قاری کا اعتماد شکستہ ہوا ہے اور یہ جو ردِّ عمل ہے وہ بھی عوام کی کچہری سے اٹھا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے بھی دشنام طرازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ میری ساٹھ سال کی زندگی اور تحریریں آپ کے سامنے ہیں۔ میری یہ درخواست اخبارات میں چھپ چکی ہے کہ میرے دشنام کا ایک آدھ نمونہ ہی پیش کر دیجیے۔ یہ گزارش میں آپ سے بھی کرتا ہوں۔"

حسن رضوی: کیا آیندہ مستقبل میں اختلافات ختم ہونے کا امکان ہے؟

انور سدید: "ذاتی اختلافات تو کسی وقت بھی ختم کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ظرفِ عالی کی ضرورت ہوتی ہے جس کی اس دَور میں شدید کمی ہے۔ متذکرہ بزرگ ادیب کے ایک رفیقِ خاص تو فرما رہے ہیں کہ ایک دشنام آمیز جملہ کہہ دیا گیا ہے تو اس سے کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ کیا یہ دل سے احساسِ زیاں چلے جانے کی مثال نہیں ہے؟ ظفر اقبال صاحب تو حل پیش کر چکے ہیں کہ اس اہانت آمیز جملے پر بزرگِ محترم کو معذرت کرنی چاہیئے لیکن اس عمل میں ان کی جھوٹی انا آڑے آ رہی ہے۔ جہانِ کہنہ کے ناخدا زمین پر اترنے اور درویشوں کی صدا سننے پر آمادہ نہیں۔ اور درویش انھیں اقبال، مجید امجد، راشد، میرا جی اور فیض سے بڑا شاعر اور راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور غلام عباس، حیات اللہ انصاری سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ہمارے بزرگ اور معمّر شاعر کو جو اقبال، جوش اور اختر شیرانی کے چربے

اتارنے میں ماہر ہیں۔ ان کے ایک لطیفہ پسند دوست نے یہ باور کرا دیا کہ نعوذ باللہ خدا کے بعد وہ سب سے عظیم ادبی تخلیق کار ہیں اور وہ اتنے تعریف پسند ہیں کہ اس تعریف کے گھنے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں اور مشاعرے سے کھینچ کر نکال دیئے جائیں تب بھی محسوس نہیں کرتے کہ ان کی تعریف کے پردے میں ان کے ساتھ کتنی بڑی ستم ظریفی کی گئی ہے۔ کچھ یہی کیفیت اس دور کے بیشتر بزرگ ادبا کے بارے میں بتائی جا سکتی ہے۔ ضرورت خود احتسابی کی ہے شدید ضرورت!"

حسن رضوی: پاکستان میں ترقی پسند تحریک کا مستقبل کیا ہے؟

انور سدید: "ترقی پسند تحریک کے قائدین خود اعتراف کر چکے ہیں کہ یہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ پاکستان میں اس تحریک کے آخری جنرل سیکرٹری احمد ندیم قاسمی تھے۔ وہ حال ہی میں حج کرنے تشریف لے گئے! ۔ اس تحریک کی نظریاتی اساس کو اچھی اور قابلِ تقلید عملی مثال میسر نہیں آئی۔ بیشتر ادیبوں نے ذاتی ترقی کی طرف تیزی سے پیش قدمی کی اور بہبود کے اداروں میں ملازمتیں حاصل کر لیں۔ آبکاری کے مقابلے میں ٹھیکیداری بھلی نظر آنے لگی۔ تخلیقی اعتبار سے بھی اب اسے بانجھ ہی کہنا چاہیئے۔ کیونکہ اب عرصے سے کوئی بڑا ادیب یا بڑا فن پارہ منظر پہ نہیں آیا۔ سیاسی افق پر جو تبدیلیاں روبہ عمل ہیں ان سے ادب کا منظر گدلا ہوا ہے۔ پاکستان میں اس تحریک کے مستقبل کے بارے میں مزید پیش گوئی کرنا شاید ممکن نہیں"۔

حسن رضوی: کیا یہ درست نہیں کہ اس تحریک نے اُردو ادب کی شاہ کار تخلیقات کو جنم دیا ہے؟

انور سدید: "ترقی پسند تحریک بلاشبہ اُردو ادب کی ایک فعّال اور طغیانی تحریک تھی۔ اس نے چوتھے اور پانچویں دہے کے ادیبوں کو بہت متاثر کیا اور سائنسی اندازِ نظر دیا۔ موضوعات کے اعتبار سے انوکھی تخلیقات پیش کیں، فرد کو آزادی اور مساوات کا خواب دکھایا۔ لیکن آزادی کے بعد جب اس تحریک کی سیاسی جہت کھل کر سامنے آ گئی تو اس کا تار و پود حکومت نے بکھیر دیا۔ ادب پس منظر میں چلا گیا اور سیاست کی سیاہ کاری منظر پہ اُبھر آئی، ترقی پسند تحریک کے سب ثمرات شیریں نہیں تھے۔ اس نے ادیب کو شہرت کا جویا۔ نخوت پسند اور انتہا پرست بنایا۔ اُردو

ادب میں پہلا مارشل لا بھی اس تحریک نے ہی لگایا تھا۔ اور بعض بڑے ادبا کو ترقی پسند رسائل سے نکال دیا گیا تھا۔ یعنی ان کی تخلیقات ان رسائل میں شائع نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہدامِ اقبال کی تحریک چلائی گئی اور تنقید میں انتہا پسندانہ رویّہ رائج کیا گیا۔ اس دَور میں حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک بھی متوازی خطوط پر چل رہی تھی اور ایک مخصوص طبقے میں مقبول تھی۔ اس کے اثرات بھی دُور رس ہیں۔"

حسن رضوی: کیا آپ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں؟ اور کیا آپ نے اس وجہ سے ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی تقریبات میں کراچی شرکت کی تھی؟

انور سدید: "برادرم! مجھے ادب کی ہر تحریک سے طالب علمانہ دلچسپی ہے۔ مَیں نے اس موضوع پر ایک مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ "اُردو ادب کی تحریکیں"۔ کراچی کی تقریبات میں مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔ مَیں ان دِنوں اتفاق سے کراچی میں تھا۔ اس لیے اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کے لیے کھلے جلسوں میں شریک ہوا۔ مَیں اس کانفرنس کا مندوب نہیں تھا۔ نہ ہی ایسی کچھ خواہش تھی۔ لیکن یہ اچھا ادبی تجربہ ثابت نہیں ہوا۔ کانفرنس کے بعض مناظر دیکھ کر ذہنی تکلیف محسوس کی اور ادیب کو بلند منصب سے گرتے دیکھا تو دُکھ ہوا۔ لکھنؤ میں فیض میلے کا دعوت نامہ مجھے ارسال ملا تھا۔ یہ بھی ترقی پسند ادبا ہی کا جمِ غفیر تھا لیکن میں شریک نہ ہو سکا۔ دلّی میں ڈاکٹر محمّد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس اور علی سردار جعفری سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے پاکستانی ترقی پسندوں سے زیادہ لبرل نظر آئے۔ ان میں برداشت کی قوّت بھی زیادہ دکھائی دی۔ اختلافِ رائے پر وہ گفتگو کا دروازہ بند نہیں کرتے اور اسے ذاتی عناد نہیں بناتے۔ آپ دلّی میں کھلی اور آزادانہ بحث کے بعد چائے کی میز پر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی ترقی پسند شدید تنگ نظری کا شکار ہیں۔"

حسن رضوی: ہمارے یہاں مختلف اسلوب میں افسانہ نگاری کی جا رہی ہے — علامتی افسانے کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

انور سدید: "علامت کا استعمال اُردو میں نیا نہیں بلکہ ملّا وجہی کے زمانے سے رائج ہے۔ چھٹی دہائی میں چند پاکستانی افسانہ نگاروں نے اسے فروغ دینے کی سعی کی اور پھر یہ سکّہ رائج الوقت کی طرح مقبول ہو گیا۔ اور ہندوستان میں بھی

اس نوع کا افسانہ لکھا جانے لگا۔ میرا خیال ہے کہ تجریدا ور علامت کے تجربے کو پاکستان میں اوراق نے اور ہندوستان میں شب خون نے سب سے زیادہ متعارف کرایا۔ یہ جدیدیت کی اس رو کا ترجمان تھا، جسے یہ دونوں پرچے پروان چڑھا رہے تھے۔ دوسری طرف حقیقت یہ بھی ہے کہ علامتی افسانے قاری کے ساتھ اپنا ناتہ مضبوط نہ کر سکے، پھر اس میں تن آسانی در آئی۔ بعض لوگوں نے اسے فیشن کے طور پر قبول کیا تو وہ علامت کی فن کارانہ تخلیق پر قدرت حاصل نہ کر سکے۔ کہانی کے غیاب نے مزید مشکل پیدا کردی۔ اس قسم کے افسانے چیستاں بن گئے جن کی گرہ کشائی عام قاری کے بس کی بات نہیں تھی۔"

حسن رضوی: آپ کو کون کون سے افسانہ نگار پسند ہیں؟

انور سدید: "بھائی میری پسند کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے چھوٹے افسانہ نگار کو پڑھنے اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں راجندر سنگھ بیدی اور منٹو کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ میں ممتاز مفتی اور بلونت سنگھ کو بھی پسند کرتا ہوں۔ قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، غلام الثقلین نقوی، فرخندہ لودھی بانو قدسیہ، اشفاق احمد، غیاث احمد گدی بھی میرے محبوب افسانہ نگار ہیں۔ رام لعل کے کئی افسانوں کے عنوانات میری لوحِ دماغ پر کندہ ہیں۔ مثلاً چابک جڑیں، فرضی آگ کی لو، ایک شہری پاکستان کا، رفیق حسین، وقار لطیف، غلام علی چودھری، مسعود شاہد، شمس آغا کو شاید لوگ بھول چکے ہوں۔ مجھے ان کا ایک ایک افسانہ یاد ہے۔ علامت نگاروں میں سے رشید امجد۔ بلراج کومل، منشا یاد، انتظار حسین، سریندر پرکاش، قمر احسن، علی تنہا، انور زاہدی نے اپنا نقش پائیدار پیدا کیا ہے۔ اب حال ہی میں طارق محمود، بیرراجہ، نگہت محمد سعید شیخ، سلیم آغا قزلباش کے نام ابھرے ہیں۔ اور ذہن پر نقش ہوگئے ہیں۔ یہاں اپنی پسند کے سب نام گنوانا ممکن نہیں۔ حال ہی میں میں نے مناظر ہرگانوی اور جیلانی بانو پر لکھا تو ان کے فن کے کئی نئے گوشے منور ہو گئے۔ دل

عش عش کر اٹھا۔ کلام حیدری کی جراحت مجھے مرغوب ہے۔ حافظے کی لوح پر اب آہستہ آہستہ نام اُبھر رہے ہیں۔ اقبال مجید، عوض سعید، احمد یوسف، انور عظیم ظفر اوگانوی، شرون کمار ورما، ہرچرن چاولہ، رتن سنگھ ....“

حسن رضوی : شاعر کون کون سے پسند ہیں ؟

انور سدید : ”یہ سوال بھی اسی نوعیت کا ہے۔ جدید شاعروں میں سے مجید امجد، وزیر آغا، سرمد صہبائی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہزاد احمد، بانی، راج نرائن راز، کمار پاشی، زبیر رضوی، مظہر امام، بلراج کومل، بشر نواز، شہریار، آنند دگلاٹی، بے شمار نام یاد آ رہے ہیں جن کا میں مدّاح ہوں۔ مجھے ترقی پسند انداز میں نعرہ لگانے والی اور منطقی دائرہ مکمل کرنے والی نظم بالکل پسند نہیں۔ نئے لکھنے والوں میں سے خالد اقبال یاسر، ماہ طلعت زاہدی، جمال احسانی، ثروت حسین فرحت نواز، سیما شکیب، انجم نیازی، حیدر قریشی، شہپر رسول اپنا نقش خوب قائم کر رہے ہیں۔ شہناز نبی کی ایک نظم ”پرانا اور نیا قصہ“ اوراق میں چھپی تھی مجھے بہت اچھی لگی۔“

حسن رضوی : آپ کے پسندیدہ کالم نگار کون کون سے ہیں ؟

انور سدید : ”ہمارے ہاں زیادہ تر کھردری کالم نگاری ہو رہی ہے۔ شخصی طنز جراحت آمیز ہے۔ ادبی کالم نگاروں میں سے مجھے کبھی انتظار حسین کا غیر روایتی انداز پسند تھا۔ اب خامہ بگوش کو باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ میرے پاس ان کے کالموں کا مکمل فائیل موجود ہے۔ ہمارے ہاں جعلی آرٹ بکوالڈ زیادہ ہیں۔ اور یہ کالم کو بلیک میلنگ کا وسیلہ بنانے میں ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے کالم — کالم کم اور اشتہار زیادہ ہیں۔ کبھی کسی سی ایس پی افسر کو شاعر ثابت کر رہے ہیں۔ کبھی کسی خلیج کے نودولت اناڑی کو ادیبِ اعظم ہونے کا احساس دلا رہے ہیں۔“

حسن رضوی : سفر نامہ کا ادب میں کیا مقام ہے۔ آپ کس سفر نامہ نگار کو پسند کرتے ہیں ؟

انور سدید : ”سفرنامہ ادب کی اہم اصنافِ نثر میں سے ہے۔ آزادی کے بعد اسی صنف نے تیزی سے ترقی کی۔ علامتی افسانے کے عروج کے دور میں جب افسانے اور قاری

کے درمیان رشتہ کمزور ہو گیا تھا تو سفرنامے نے کہانی کے خلا کو پُر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُردو سفرنامے کو آپ بیتی کے انداز اور تخیّل کی رنگ آمیزی نے ایک نیا پیکر بنا دیا اور یہ بڑا خوش رنگ نظر آنے لگا۔ وہ سفرنامہ نگار جو سفر میں نظر کو شامل کرتے ہیں اور کم سے کم جھوٹ بولتے ہیں مجھے پسند ہیں۔ حال ہی میں جو سفرنامے آئے ہیں ان میں سے بلقیس ظفر اور پروین عاطف کے سفرناموں میں پڑھے جانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ ہندوستان کو انتظار حسین نے گم شدہ بوڑھے کی طرح دیکھا۔ ممتاز مفتی کے ذہن پر ان کا ماضی سوار رہا۔ رفیق ڈوگر نے سیاسی ہندوستان پر نظر ڈالی۔ "دیکھا ہندوستان" میں ادب اور ادیب کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ اسی نوعیت کے دو طویل سفرنامے رام لعل نے لکھے۔ ایک پاکستان کے بارے میں اور دوسرا یورپی ممالک کے بارے میں۔ اس قسم کے سفرنامے جوگندر پال، بلراج کومل، ہرچرن چاولہ، راغب شکیب، حنیف چودھری اور جمیل زبیری نے بھی لکھے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے جس حیرت کو جگایا تھا۔ اب شاید وہ ختم ہو گئی ہے۔ اور وہ سیّاح کے بجائے افسانہ نگار نظر آنے لگے ہیں۔ "جنزہ داستان اور خانہ بدوش" پڑھ کر مجھے یہی احساس ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ہو۔"

حسن رضوی: کیا صحت مند ادب کے لیے طنز و مزاح کا ہونا ضروری ہے طنز و مزاح کا ہمارے ادب میں کیا مقام ہے؟

انور سدید: "طنز و مزاح ادب کے لیے ہی نہیں زندگی کو صحت مند رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ مزاح فالتو انرجی کا صحت مندانہ میں اخراج کر ڈالتا ہے اور زندگی کا اگلا قدم اٹھانے کے لیے انسان صحت مند ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑوں کو نئی آکسیجن مل جاتی ہے۔ واضح رہے کہ طنز اور مزاح زندگی پر نظر ڈالنے کے زاویے ہیں اور ان کا استعمال سلیقے سے نہ ہو تو جراحت پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات ابتذال پر بھی منتج ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں شعورِ مزاح کم اور طنزیہ تلخ کامی زیادہ ہے۔ پھر طنز و مزاح کا دامن بعض مسخروں کے ہاتھ میں آ گیا ہے جو صدرِ مملکت سے لے کر فتو لوہار تک کو ہنسانے پر مامور ہیں۔ اس قسم کے لوگ اسے طعن و تضحیک کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور اسے باعزت مقام سے پرے دھکیل رہے ہیں۔ تاہم رشید احمد

صدیقی، فرحت اللہ بیگ اور پطرس نے جو بلند معیار قائم کیا تھا۔ اسے مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، صدیق سالک، ضمیر جعفری، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ جیسے مزاح نگاروں نے ارتقا کی طرف قدم بڑھانے میں مدد دی ہے۔ حال ہی میں میری ملاقات ہر گانوی صاحب سے ہوئی اور یہ مجھے انوکھے مزاح نگار نظر آئے۔ مشفق خواجہ کا مزاح بھی انوکھا ہے۔ شاعری میں عرصے کے بعد نیاز سواتی، سرفراز شاہد دو اچھے مزاح نگار سامنے آئے ہیں۔ شعورِ مزاح کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ سنیئے۔ پچھلے دنوں ایک مشہور ادیب کی سترّویں سالگرہ منائی گئی۔ اس تقریب کا تصویری خبر نامہ ماہنامہ "ظرافت" میں پیش کیا گیا۔ ایک تصویر میں ممتاز دانشور سراج منیر صاحب ادیبِ مذکور کو گل دستہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

کل میاں حجام سب کا مونڈتے پھرتے تھے سر
آج اس کوچے میں ان کی بھی حجامت ہو گئی

یہ واقعہ اگرچہ مدیرِ ظرافت کی غفلت کا نتیجہ ہے لیکن دیکھئیے ایک سنجیدہ عمل کو کیسی مزاحی کروٹ مل گئی ہے۔"

حسن رضوی: ۱۹۶۰ء میں جیلانی کامران، انیس ناگی اور افتخار جالب نے نئی نظم کی بنیاد رکھی تھی۔ کیا یہ حقیقت ہے؟

انور سدید: "حسن رضوی صاحب جس نئی نظم کی بنیاد ۱۹۶۰ء میں رکھی گئی تھی وہ ہے کہاں؟ افتخار جالب اپنی نئی لسانی تشکیلات میں ظفر اقبال جیسے شاعر کو بھی لے ڈوبے۔ جیلانی کامران کی آواز سنی نہ گئی۔ اب انیس ناگی تنہا اپنا ڈھول بجا رہے ہیں۔ یہ تو منفی عمل تھا اس نظم کے خلاف جسے میراجی، راشد، یوسف ظفر، قیوم نظر، اور مجید امجد جیسے شعرا نے پروان چڑھایا تھا۔ برہم نوجوانوں اور باغی شاعروں کا تجربہ زمین سے کٹا ہوا اور باس سے محروم تھا۔ اس لیے کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اب اس کی بازگشت بھی سنی نہیں جاتی۔ لیکن آزاد نظم مسلسل ترقی کر رہی ہے۔ وزیر آغا، بلراج کومل، شہزاد احمد، ذوالفقار احمد تابش، ادیب سہیل، احمد ظفر، تخت سنگھ،

فیاض تحسین، حمید الماس، حفیظ صدیقی، مناظر ہرگانوی، شبنم مناروی، رشید نثار، حیدر قریشی، انور زاہدی، کشور ناہید، اظہر جاوید اور متعدد دوسرے شعرا بہت اچھی نظمیں لکھ رہے ہیں۔"

حسن رضوی: نثری نظم کو کچھ ناقدین نظم نہیں مانتے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

انور سدید: "۱۹۶۰ء کی نئی نظم کے تجربے کی طرح نثری نظم کا تجربہ بھی مناسب ریاض اور تربیت کے بغیر کیا گیا ہے۔ تجربے کے طور پر تو اسے آزمانے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن شاید یہ نظم کے مقابل نہ آسکے اور بہت جلد ماضی کے نامقبول تجربوں کی طرح معدوم ہو جائے۔ ہندوستان میں تو آزاد غزل کا تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ غزل کی موجودگی میں مجھے آزاد غزل کا جواز نظر نہیں آتا۔ شاید ڈاکٹر خورشید الاسلام اور کشور ناہید کی نثری شاعری کو کچھ لوگ پسند کر لیں اور اس کیفیت کو پا لیں جو تخلیق کے لمحے میں ان پر وارد ہوئی تھی۔"

حسن رضوی: ہمارے ہاں تراجم بہت کم ہوئے ہیں۔ آپ کے خیال میں معیاری مترجم کون کون ہیں؟

انور سدید: میرا خیال ہے کہ انگریزی سے اُردو میں تراجم کی تعداد اتنی بھی کم نہیں کہ ہم شرمندگی محسوس کریں۔ ۱۷۴۴ علمی تراجم کی کتابیات حال ہی میں مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی ہے۔ تخلیقی ادب کے تراجم کی تعداد تو شمار کرنا ممکن ہی نہیں۔ تراجم انفرادی طور پر بھی ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے ادارے بھی قائم کیے گئے تھے۔ سیرام پور کا مشنری ادارہ اور فورٹ ولیم کالج اس کی قدیم ترین اور مقتدرہ قومی زبان اور ترقی اُردو بیورو دہلی اس کی تازہ مثالیں ہیں۔ اچھے مترجموں کی بھی کمی نہیں۔ مولوی عنایت اللہ ظفر علی خاں، ڈاکٹر عابد حسین، اشتیاق حسین قریشی، صادق الخیری، فضل حق قریشی، شاہد احمد دہلوی۔ عابد علی عابد اور اب آصف فرخی، روبینہ ترین اور نسیم شاہد کے ساتھ شہزاد احمد جیسے ممتاز ادیب بھی تراجم نگاری کر رہے ہیں۔ اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کتب کے تراجم اُردو سے دوسری

زبانوں میں زیادہ تعداد میں کیے جائیں تاکہ ہمارے ادب کی کھڑکی بیرونی دُنیا میں بھی کھل سکے۔"

حسن رضوی : بھارت اور پاکستان میں اُردو ادب کی ترویج و ترقّی کے لیے کس قسم کے روابط کی ضرورت ہے ؟

انور سدید: "ضرورت ہے خیر سگالی کے بہترین روابط کی۔ ادیبوں کی آزادانہ آمد و رفت کی۔ کتابوں اور رسالوں کی ارزاں ترسیل و تبادلہ کی۔ مشترکہ ادبی سیمیناروں اور مشاعروں کا انعقاد بھی خیر سگالی کے لیے مفید ہوگا۔ ہماری حکومت نے ہندوستانی ادیبوں کو پاکستان میں آنے کی سہولت فراوانی سے دی ہے لیکن پاکستانی ادیبوں کو ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ اکادمی ادبیات کو اس قسم کے دورے ترتیب دینے چاہییں اور پسندیدہ بھتیجے، بھتیجیوں کے بجائے نمایندہ ادیبوں کو بیرونِ ملک بھیجنا چاہیئے۔ ادبی وفد اور مقابلۂ حُسن کے وفد میں کچھ تو مابہ الامتیاز قائم ہونا چاہیے۔"

حسن رضوی : آپ نے مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ادب کے فروغ میں ان کا کردار کیا ہے ؟

انور سدید : "میں نے مشاعرے کو صرف خیر سگالی کے لیے استعمال کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ مشاعرہ ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا نہیں کرتا بلکہ اب یہ سستی تفریح کا وسیلہ بن گیا ہے۔ شاعر سامع کی سطح پر اتر کر شعر سناتا اور اس کی پسند کو ملحوظ رکھتا ہے۔ ہوٹنگ میں تضحیک کا نشانہ بھی بنتا ہے مشاعرہ میں شاعر ایک ایکٹر کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور مختلف حربے استعمال کر کے کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے اور اکثر ایک ہی غزل جسے سامعین متعدد بارسن چکے ہوتے ہیں بار بار سناتا ہے۔ تاکہ ہوٹنگ سے بچ جائے۔ بہت سے شعرا اس داد کو حقیقی سمجھ لیتے ہیں جو انہیں مشاعرے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جب یہی غزل چھپ کر آتی ہے تو نقّاد کی توجّہ کھینچ نہیں سکتی اور ناکام قرار دے دی جاتی ہے۔ مشاعرے کی داد میں نوحہ گروں کا عمل دخل

بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ پبلک مشاعرے ادب کے اور شاعر کے زوال کا باعث ہیں۔"

حسن رضوی : کیا ادب جغرافیائی حدود کا پابند ہوتا ہے ؟

انور سدید : "جی نہیں! اچھا ادب تو جغرافیائی حدود کو خوشبو کی طرح عبور کر جاتا ہے۔ روشنی اور ہوا کی طرح ادب اپنی رفتار اور سمت خود متعین کرتا ہے۔ اچھا ادب اپنے ملک کا سفیر بھی ہوتا ہے اور اس خطے میں فروغ پانے والے جذبات اور احساسات کا آئینہ دار بھی۔ اچھا ادب بیک وقت قومی بھی ہوتا ہے اور بین الاقوامی بھی۔"

حسن رضوی : پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تفریق کیا ہے ؟

انور سدید : "میرے خیال میں پاکستانی ادب میں زندگی اور معاشرے کو اسلامی دین اور رویّے کے مطابق دیکھنے کا عمل اور ڈھالنے کی آرزو شامل ہے۔ ویسے پاکستانی ادب سے مراد وہ تمام ادب ہے جو پاکستان میں بولی اور لکھی جانے والی زبانوں میں تخلیق ہو رہا ہے۔ اسلامی عناصر کے حوالے سے یہ ادب دوسرے اسلامی ممالک کے ادب میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں عالم گیر ہاشمی نے انگریزی میں ایک کتاب "دی ورلڈ آف مسلم امیجی نیشن" شائع کی ہے جس میں پوری اسلامی دُنیا کے تخلیقی ادب کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پاکستان سے راشد، وزیر آغا، مجید امجد، منیر نیازی، فیض، جیلانی کامران، سرمد صہبائی کی نظمیں اور خالدہ حسین اور محمد سلیم الرحمٰن کے افسانے شریک کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے شاید میری بات کی اور آپ کے سوال کی وضاحت ہو گئی ہو گی۔ تاہم اگر سوال اُردو ادب کا ہو تو اس میں ان تمام ممالک کا ادب شامل کرنا لازم ہو گا، جہاں اُردو بولی جاتی ہے اور ادب کی زبان ہے۔ اُردو کی راج دھانیاں اب پوری دنیا میں قائم ہو گئی ہیں۔"

حسن رضوی : اپنی نجی اور پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں کچھ کہیے!

انور سدید : "بھائی! میری پیشہ ورانہ زندگی بھی ادبی زندگی کی طرح چنداں اہم

نہیں، جتنی محنت کی خدا نے اس کا پھل توقع سے زیادہ دے دیا۔ میرے والدین معمولی سفید پوش تھے۔ میٹرک تک پڑھانے کے بعد بھائیوں نے کفالت کی۔ لیکن ایف ایس سی کرنے کے بجائے میں انجینئرنگ سکول رسول میں سول انجینئرنگ کرنے چلا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں بطور سب انجینئر عملی زندگی کی ابتدا کی بارہ سال کے بعد محکمانہ امتحان پاس کر لینے کی وجہ سے ایس ڈی او بنا۔ آگے بند گلی تھی۔ رستہ تلاش کرنے کے لیے ڈھاکہ انسٹی ٹیوٹ سے اے۔ ایم آئی ای کیا۔ ایگزیکٹو انجینئر بننے کا راستہ کھل گیا۔ اس عہدے پر گیارہ سال کام کیا۔ اب حال ہی میں گریڈ ۱۹ میں ترقی ملی ہے اور اسی سال ریٹائر ہو جاؤں گا۔

میں نے ایف اے سے پی ایچ ڈی تک کے امتحانات بھی ملازمت کے دوران ہی پاس کیے۔ تین گولڈ میڈل حاصل کیے۔ ایم اے میں میرا بیرونی طلبہ کا ریکارڈ ابھی تک قائم ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر بنا ہے۔ دوسرے نے پولٹری میں ایم ایس سی کی ہے۔ چھوٹے دو لڑکے انجینئرنگ کا فائنل امتحان دینے والے ہیں۔ ایک بیٹے کی شادی کر دی ہے۔ دوسرے کی کرنے والا ہوں۔ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ میرے چند بے حد مخلص دوست اور وہ کتابیں ہیں جو میں نے پڑھی ہیں۔ مسرت کے قیمتی لمحات اس وقت میسر آتے ہیں جب اپنی میز پر بیٹھ کر لکھتا ہوں۔ لاہور میں پانچ مرلے کے عظیم الشان "محل" میں میں بڑی طمانیت اور آسودگی کی زندگی گزار رہا ہوں اور بے حد خوش ہوں۔ نہ ہوسِ مال ہے نہ ہوسِ زر، نہ ہوسِ شہرت!"

حسن رضوی: کوئی ایسی بات جو آپ حرفِ آخر کے طور پر کہنا چاہیں؟

انور سدید: "حسن رضوی صاحب! آپ نے کوئی بات چھوڑی ہی کہاں ہے۔ جو اب حرفِ آخر قرار پائے۔ مجھے آپ کی گفتگو نے تازہ دم کر دیا ہے۔ آپ کی معیت میں چند خوش گوار لمحے میسر آئے اور ادب، ادبی معاشرہ، ادبا اور اپنی ذات کے اندر جھانکنے کا موقعہ ملا۔ آپ نے یہ موقع پیدا کیا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ وگرنہ یہ باتیں شاید میرے سینے میں ہی مدفون رہتیں، آپ نے ان کی کھدائی کی اور خوب کی۔"

ادیب سُہیل

انور سدید صاحب

جب انور سدید صاحب سے اپنے تعلق کا ذکر آئے گا تو لامحالہ ڈاکٹر وزیر آغا سے بات کا آغاز کرنا پڑے گا کہ انھیں کے توسط سے انور سدید صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں مشرقی پاکستان میں ہوتا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تعلق برسوں پرانا ہے۔

ہمارے ادب میں ایک سے زیادہ اصناف میں طبع آزمائی پر چونکنے والے اب بھی مل جاتے ہیں۔ اگر ایسے شخص کا نام یا کام زیرِ بحث آجائے تو لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں، مزے کی بات یہ ہے کہ ہم ہر بات میں یورپ کے حوالے دیتے ہوئے نہیں تھکتے، لوگوں پر اپنی مغرب رسی اور مغرب فہمی کے لیے کبھی دیدہ و دانستہ اور کبھی اٹکل پچو کچھ نام گنوا کر، آزدہ بازو خفیف سی نظر دوڑا کر ایسی بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ حاضرین پر ان کی انگریزی دانی کا رعب پڑا کہ نہیں۔ لیکن یہاں ان سارے مغربی اہلِ قلم کو بھول جاتے ہیں جو خواہ ایلیٹ ہوں، ہرمن ہیسے ہوں، لورکا ہوں، پاؤنڈ ہوں، سارتر ہے یا مادام سائمن ڈی بوار ہوں، سب کے سب بیک وقت شاعر بھی تھے، ڈرامہ نگار بھی تھے، ناول نویس بھی تھے اور تنقید نگاری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے اور فلسفیانہ جہت و نظریہ سے بھی ادب کو نواز رہے تھے۔

یہ باتیں بیان کر کے محض ایک رویّہ کی بات کر رہا ہوں ورنہ اب ہمارے یہاں ایسے اہلِ ادب کی ایک کھیپ چل پڑی ہے جو ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کر رہی ہے۔ ادیبوں کے اس کارواں میں اب "یک صنفے" انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ شاید ان کا اب بھی یہ خیال ہو کہ PERFECTION کے لیے کسی ایک راہ کا انتخاب اور اس پر دل جمعی سے چلتے رہنا ضروری ہے لیکن شاید انھیں یہ معلوم نہیں کہ "پرفیکشن" کا تعلق ادیب کی فکری بلندی یا قدو قامت سے ہے، صنف یا اصناف سے نہیں۔ بہر حال اُردو ادب کی تاریخ کا جائزہ

لیں تو معلوم ہو گا کہ خال خال ہی سہی ماضی قریب و بعید میں ادیب ایک سے زیادہ سمتوں میں چلا ہے۔ ماضی قریب میں علامہ نیاز اور مجنوں گورکھپوری کے نام نامی لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے بہت سی ادبی اصناف میں اپنا لوہا منوایا اور رجحان ساز بھی کہلائے۔ ماضی بعید میں مثالاً (۱۸۴۹ء) ایک نام نواب امداد امام اثر کا لوں گا۔ (تلاش کرنے پر کئی اور نام بھی مل سکتے ہیں) جنھوں نے "کاشف الحقائق" جیسی اہم تنقیدی و تحقیقی کتاب لکھی ہو۔

انور سدید صاحب کی VARSALITY بھی اسی شمار قطار میں ہے۔ انھوں نے اُردو ادب کی مختلف اصناف کے لیے اپنا وقت اور اپنا ذہن وقف کیا۔ اس کام میں جتنی استقامت اور جس قدر پتّہ مارنے کی ضرورت ہے اس کا مظاہرہ کیا اور کامیاب و بامراد لوٹے۔ انشائیہ ہو یا افسانہ نگاری، تحقیق و تنقید ہو یا شاعری، "سفرنامے" پر تحقیق ہو یا کوئی اور صنفِ ادب، سب میں قدم ڈالے، انھیں اپنے اندر رسنے بسنے اور تحلیل ہونے کے مواقع فراہم کیے تاکہ خیال آرائی عبارت میں ڈھال کر کا تالے ڈوری نہ لگے۔ اتنی سمتوں میں بہ یک وقت سفر، وسیع تر مطالعے، غیر معمولی لگن، خاص قوّتِ ارادی اور "ڈیڈی کیشن" کے بغیر ممکن نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ صبح سے شام تک انھوں نے اپنے لمحے لمحے کو بانٹ رکھا ہے۔ اسی حساب سے اس جانب ان کا قدم اٹھتا رہتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے کام سے وہ کبھی خالی نہیں ہیں۔ ایک ادبی کام ختم ہوتا ہے دوسرا لے بیٹھتے ہیں، کسی کے کام کی اس کی زندگی ہی میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہو جائے تو اسے اور کیا چاہیے۔ یہ مقام انور سدید صاحب کو اپنی محنت کے صلے میں ملا ہے کسی کا تفویض کردہ نہیں، اس کے پیچھے کوئی ڈھول تاشا بھی نہیں۔ آدمی اپنے لکھے ہوئے حرف سے پہچانا جاتا ہے، ڈھول تاشے سے نہیں۔ حرف ہی اس کی آخری اور حتمی پہچان ہیں۔

جو لوگ باہر سے گمبھیر، کم سخن اور کسی حد تک سپاٹ لگتے ہیں بعض اوقات ان میں سے کئی اندر سے باغ و بہار ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ہر وقت پھُلجھڑی چھوٹتی رہتی ہے۔ ان کا روم روم متبسّم ہوتا ہے اور ایسے افراد کے یہاں WITTIOUS جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ اگر ایسے شخص کو اظہار کے لیے

قلم بھی ودیعت ہو جائے تو پھر دیکھئے اس کی کیا کیا صورتیں منظرِ عام پر آتی ہیں۔ کاغذ پر منتقل ہو کر یہ تبسّم واشگاف صورت اختیار کر لے تو وہ مزاح کی راہ لیتا ہے۔ اس میں قدرے طنز کی گھلاوٹ ہو تو زہر خند بن جاتا ہے لیکن جب یہ تبسّم زیرِ لب ہو تو پھر انشائیے کی حدوں میں داخل ہوتا ہے۔ انور سدید صاحب کا متبسّم INNER SELF زیرِ لب ڈھلا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے انشائیہ کا قالب ہی موزوں ہو سکتا تھا۔

انور سدید صاحب کی ایک اور گراں قدر تصنیف "اُردو ادب کی تحریکیں" ہے۔ اسی پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ یہ بہت زیادہ پڑھی جا رہی ہے۔ یہ بات میں الل ٹپ نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کتاب کو "انجمنِ ترقی اُردو، پاکستان" نے چھاپا ہے۔ اس کے سیل ڈیپارٹمنٹ کے اندازے کے مطابق یہ سب سے زیادہ فروخت ہو رہی ہے، کسی کتاب کا بہت زیادہ مانگ میں رہنا بھی اس کی مقبولیت کا ایک بیرومیٹر ہے۔ ویسے بھی اپنے موضوع پر انور سدید صاحب کی یہ تصنیف پڑھنے والے کو اپنی جامعیت کا احساس دلاتی ہے۔

اُردو ادب میں "سفر نامہ" کو مکمل کتاب بنانے کے لیے انھوں نے جس کد و کاوش سے کام لیا ہے، اس کی دو ایک جھلک میں نے انجمن کے کتب خانہ خاص میں ان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر دیکھی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اوراق کے تازہ خاص نمبر میں برادرم رحمٰن مذنب نے جس بہتر انداز میں کی ہے، اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے اندازے سے کہیں بڑھ کر ثابت ہوگی اور "سفر نامے" کے باب میں ایک انفرادی انداز سے منظرِ عام پر آئے گی۔[۵]

انور سدید صاحب کی شخصیت و فن پر یہ باتیں میں نے جستہ جستہ مطالعے کی بنیاد پر کی ہے۔ کسی ایک کتاب پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی خود میں بھی استطاعت نہیں پاتا ہوں۔ انور سدید صاحب کا یہ قرض مجھ پر رہے گا۔ میں جب بھی اس کا اہل ہو سکا تو یہ قرض اتار دوں گا۔ خط و کتابت کے توسط سے مجھے اس بات کا تجربہ ہوا ہے کہ انور سدید صاحب کسی معاملے میں جو بات کہنا چاہتے ہیں دو ٹوک کہہ دیتے ہیں لیکن اس بارے میں میرا اپنا خیال ہے کہ جو آدمی دو ٹوک کہہ سکتا ہے وہ دل کا بُرا نہیں ہو سکتا۔

---

[۵] یہ کتاب اکادمی لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

شاہین بدر

انور سدید ــــ ایک مُطالعہ

انور سدید ایک ایسی باحوصلہ شخصیت کا نام ہے جو اپنی روشنی کے تیر سے اندھیرے کا جگر چھلنی کر رہی ہے۔ شاعری ہو یا تنقید نگاری، انشائیہ ہو یا تحقیقی مقالہ، انور سدید نے ہر میدان میں اپنے فن کا لوہا منوالیا ہے اور آج بھی حق کی خاطر باطل کے خلاف سینہ سپر ہے۔

لامحدود علمی اور معاشرتی ترقی کے باوجود انسان کا وحشیانہ پن اور خود غرضانہ رویّہ ختم نہیں ہوا۔ سچائی کا بدن لہولہان ہے۔ سنہرے خوابوں کی تعبیریں سیاہ ہیں ــــ قول و فعل کا تضاد مسلسل جاری ہے۔ انور سدید اس صورتِ حال کو بدلنے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ خود غرض جذبوں اور جبلّتوں میں اسیر انسان نما حیوانوں کو شعور کی روشنی دکھانا چاہتا ہے۔

انور سدید سے میں ذاتی طور پر ۶۹ ـ ۱۹۶۸ء سے واقف ہوں۔ میں اُن دنوں سابق مشرقی پاکستان سے ایک ادبی سہ ماہی "عزمِ نو" نکالا کرتا تھا اور انور سدید کے ذمہ "اُردو زبان" سرگودھا کی ادارت تھی۔ زبان شگفتہ، اندازِ بیان دلکش، خیالات تتلیوں کے پَروں کی طرح نازک اور حسین۔ انور سدید کا جب بھی خط آتا میں اس کی طرف غیر ارادی طور پر کھنچتا چلا جاتا۔ دوسری ہجرت نے کسی کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، مجھے انور سدید ضرور دے دیا۔ ملاقات ہوئی تو لپک کر اٹھا اور سینے سے بھینچ لیا۔ اتنی گرم جوشی تھی کہ اس کی حدّت آج بھی روزِ اوّل کی طرح برقرار ہے۔

انور سدید کو جب قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ وہ مخلص یار ہی نہیں بلکہ یاروں کا یار ہے، بہترین باپ ہے، کامیاب شوہر ہے، نرم دل لیکن بااصول افسر بھی ہے اور بے حد ہر دلعزیز دوست بھی اور سب سے بڑی خوبی تو یہ

ہے کہ وہ اپنے دشمن کی بُرائی نہیں چاہتا۔ اگر بے حد مجبور ہو جاتا ہے تب بھی چُھپ کر وار نہیں کرتا بلکہ دشمن کو للکار کر اور اس کے ہاتھ میں تلوار دے کر مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ صلاح الدین ایوبی کی طرح دشمن کو بے بسی میں مبتلا نہ ہونے دو بلکہ اس کے لیے تلوار اور گھوڑا بھی مہیا کرو۔ پھر مقابلہ کرو اور دُنیا کو بتا دو کہ سچائی کا دیا باطل کے تاریک طوفان کو خاطر میں نہیں لاتا۔

انور سدید کی تحریر پڑھیے تو فکری توانائی اور فنی رعنائی میں تھکن یا اضمحلال کی بجائے عزم اور حوصلے کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آئے گا۔ اس کی تحریر میں ایک خاص انداز کا تکنیکی حُسن ہے۔ انور سدید اپنے تخلیقی تجربوں میں ذات اور کائنات کے تمام تر امکانات کا بے حد خوبصورت انداز میں احاطہ کرتا ہے۔ اس کا طرزِ تحریر یوں تو روانی سلاست اور بے ساختگی میں انفرادیت کا حامل ہے لیکن اس کی حقیقت نگاری اور تیکھے انداز نے اس کی تحریر کو جداگانہ اسلوب عطا کیا ہے۔ وہ اپنے دلکش انداز میں ایسی ایسی تلخ باتیں کہہ جاتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی بے باکی اور جرأت پر دنگ رہ جاتا ہے۔ طنزیہ اور کاٹ دار جملے اس کے انشائیہ میں ہی نہیں، کالم نگاری اور دیگر مضامین میں بھی جابجا ملتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ تحریر میں اس کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ کسی بھی مقام پر قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہو پاتا۔

انور سدید نے اپنی تحریر کے ذریعہ اتنے فن پارے جنم دیے ہیں کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ آج برِصغیر میں وزیر آغا کے بعد دوسرا اہم نام انور سدید ہی کا آتا ہے جو اُردو ادب کے افق پر شفق کی طرح رنگینیاں بکھیر رہا ہے۔

عام بات چیت میں بھی انور سدید سیریس نہیں ہوتا۔ ہمیشہ مسکرا کر باتیں کرتا ہے۔ اگر کوئی بات ناگوار بھی گزرے تو اس کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ اکثر اپنے جملوں میں ذو معنی الفاظ اس طرح استعمال کرتا ہے کہ طنز کا طنز بھی ہو جائے اور مزاح بھی برقرار رہے۔

اچھی غزل کے منفرد اشعار دل میں بہت جلد جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ وہ بجلی کی طرح چمک کر دل و دماغ میں حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دوستی بھی خوبصورت غزل کا حسین ترین شعر ہوتی ہے جس کا ایک مصرعہ آپ خود ہوتے ہیں اور دوسرا مصرعہ آپ کا دوست۔ کچھ مصرعے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھی مصرعے کے محتاج نہیں ہوتے

بلکہ ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ انور سدید بھی خوبصورت شعر کا ایسا ہی حسین اور معنی خیز مصرعہ ہے جو اپنے اخلاق کی بلندی اور فکر کی پاکیزگی کی بدولت دوسرے مصرعے کا محتاج نہیں بلکہ ضرب المثل مصرعے کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

انور سدید نے دوستی کو ہمیشہ ذات کی کسوٹی پر پرکھا ہے، کبھی مشینی عمل نہیں ہونے دیا۔ انور سدید ایک حساس اور انسانوں سے بے پناہ محبت کرنے والا آدمی ہے جو خارجی تحریک سے وابستگی اپنی ذات کے حوالے سے استوار رکھتا ہے۔ انور سدید نے اپنے فن کو کبھی پروپیگنڈا نہیں ہونے دیا۔ اس کی شاعری بھی اس کے عہد کے دکھوں اور سکھوں سے مکمل ہم آہنگ ہو کر زندگی نامہ ترتیب دیتی ہے۔ زندہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ فکر کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح شعری قالب زمان و مکان پر محیط ہو کر خود وقت میں ڈھل جاتا ہے اور ماہرانہ اور فنکارانہ پختگی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ انور سدید ایسی شخصیت ہے جو شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتی بلکہ شہرت خود اس کا پیچھا کرتی ہے۔ کوئی کافر ادب ہی ایسی پیاری ہستی کے لیے دل میں نفرت رکھتا ہوگا۔

رشید امجد — انور سدید — جمیل آذر

صغیر احمد خاں شیروانی
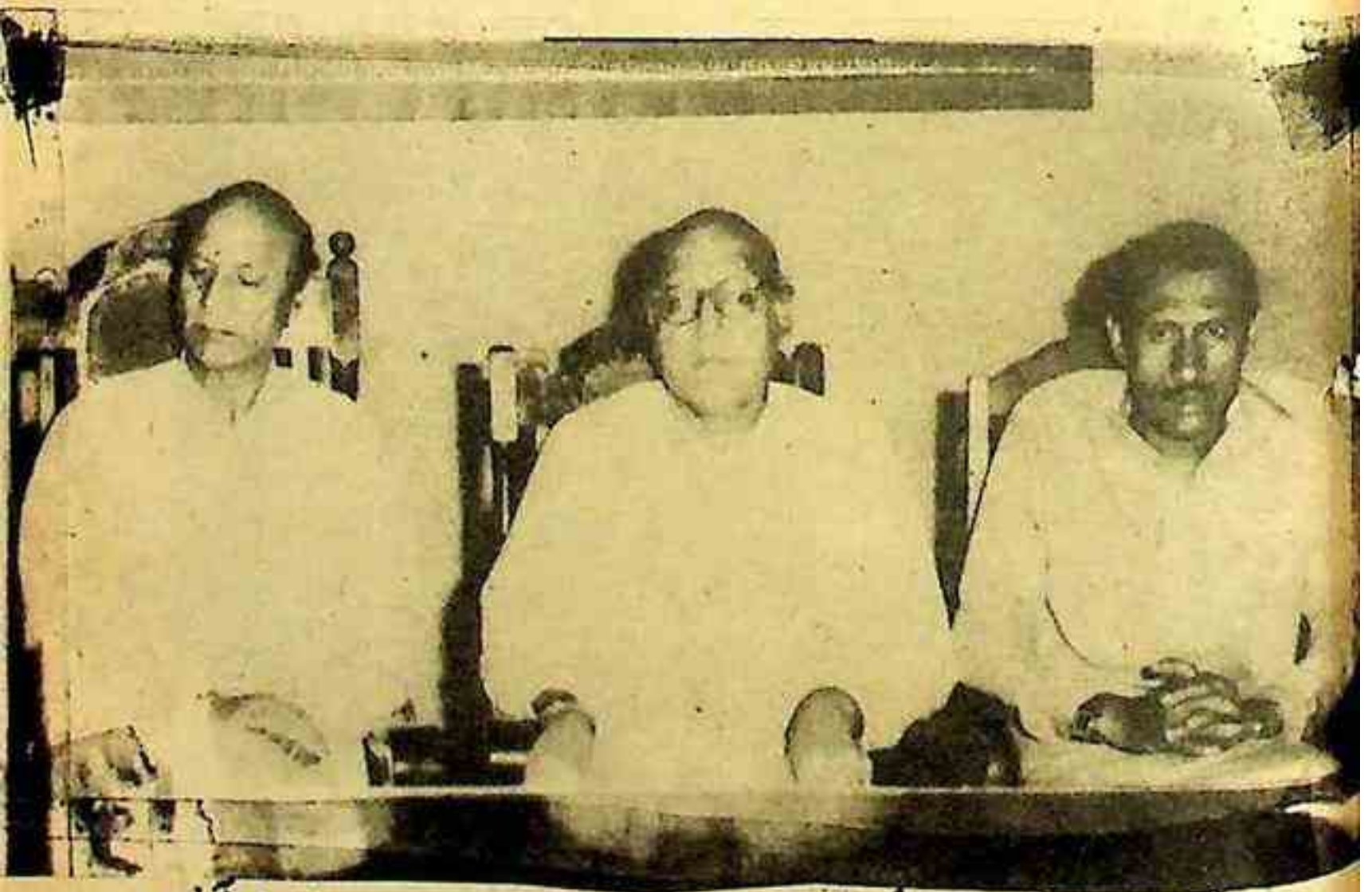
انور سدید کی تلاش

میرا پیشہ کتابت ہے اور کتابت کے سلسلہ میں سرگودھا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ آزاد بکڈپو رشید بک ڈپو اور انصار پریس میں شاعروں اور ادیبوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ خاص طور پر سیّد وزیر حسین شیرازی مرحوم کی بیٹھک پر ڈاکٹر وزیر آغا، تاج دار دہلوی مرحوم رشک ترابی، ڈاکٹر سہیل بخاری، سجاد نقوی اور فیض لدھیانوی کا تذکرہ سنتا۔ ان میں ایک نام انور سدید کا تھا جن کا تذکرہ بہت زیادہ ہوتا اور جن کی تعریف بھی بہت زیادہ کی جاتی کہ محکمہ نہر میں اتنے بڑے افسر ہیں لیکن بہت سادہ، بہت ہی با اخلاق۔ افسری کی تو ان میں کوئی بات ہی نہیں۔ یہاں آتے ہیں تو ہمارے ساتھ نیچے فرش پر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ بڑا ہی بھلا آدمی ہے لیکن میں ان کو کبھی دیکھ نہ سکا۔

اسے حسنِ اتفاق کہئے کہ ۱۹۷۷ء سالِ اقبال تھا۔ مکتبہ عالیہ والوں نے بھی اقبال کے سلسلہ میں کتابیں لکھوائیں۔ "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" جس کے مصنف ڈاکٹر سلیم اختر ہیں جب مکمل کر کے میں لاہور پہنچا تو جمیل الفبی صاحب نے مجھے ایک رقعہ دیا اور کہا کہ انور سدید صاحب سے ملیں جو سرگودھا میں رہتے ہیں اور نہر کے محکمہ میں ایکسین ہیں اور ان سے مسودہ لے لیں۔ ۲۳×۱۸/۸ سائز پر کتابت کر کے ان کو دے دیں وہ خود ریڈنگ کریں گے۔ اغلاط کی درستی کر کے ان سے چیک کرالیں پھر کاپیاں جوڑ کر لے آئیں۔

میں نے کہا۔ جمیل صاحب اِن کے متعلق آپ کے ہاں جو ذکرِ اذکار میری سماعت میں آیا اس نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ کیا کوئی آدمی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ وہ قابلِ تعریف ہو اور دوسری جگہ ....! جمیل صاحب میری بات سنکر مسکرائے اور کہنے لگے۔ بھولے بھائی۔ تم نے اپنی برادری کاتبوں میں نہیں دیکھا کہ کتنے بڑے فنکار اُستادوں کی کس طرح بھد اڑاتے ہیں۔ ہر بڑے اور شریف آدمی کے کچھ حاسد بھی ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ہم

کاتبوں میں تو چونکہ کم پڑھے لکھے لوگ زیادہ ہوتے ہیں اس لیے وہاں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ان ادباء اور شعراء میں یہ حسد والی بات کچھ عجیب سی لگتی ہے یہ تو وہ لوگ ہیں جو معاشرے کے سنوارنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ جمیل صاحب نے فرمایا۔ آپ جائیں آپ کو خود تجربہ ہو جائے گا۔ آدمی زندگی میں تجربات ہی تو کرتا ہے۔ یہ تجربہ بھی کر دیکھئے۔

میں لالیاں آگیا۔ دوسرے دن سرگودھا پہنچا۔ نہر کے دفاتر میں پہنچ کر افسروں کے ناموں کی تختیاں پڑھنے لگا تو مجھے انور سدید کے نام کی کوئی تختی نظر نہ آئی۔ اب میں نے دریافت کرنا شروع کیا، جس سے پوچھتا وہ حیران ہو کر کہتا کہ بھائی انور سدید نام کا اس محکمہ میں کوئی افسر نہیں ہے۔ پورے نہر کے دفتر کو چھان مارا۔ ایک ایک آدمی سے پوچھا جواب یہی ملا کہ انور سدید نام کے کوئی ایکسین نہیں ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر بڑے غور سے ناموں کی پلیٹیں پڑھنی شروع کیں جب کوئی تختی اس نام کی تھی ہی نہیں تو نظر کیسے آتی۔ ایک صاحب سے جن سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا میں نے کہا۔ بھائی جان! کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا تبادلہ ہو گیا ہو۔ وہ فرمانے لگے تبادلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دس بارہ سال سے میں یہاں ہوں اس نام کا تو کوئی انجینیئر محکمہ نہر میں ابتک نہیں آیا۔ آخر تھک کر میں یہ سوچ کر شہر آیا کہ کلب عباس کی بیٹھک پر جا کر معلوم کروں کہ بھائی انور سدید نہر کے محکمہ میں تو مجھے ملے نہیں مجھے بتاؤ وہ کہاں ملیں گے۔ میری بدقسمتی کہ کلب عباس بھی اپنی بیٹھک میں موجود نہیں تھے۔ واپس نہر کے دفاتر میں آیا تو اب چھٹی ہو چکی تھی۔ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں گرمی سے بُرا حال تھا۔ یہ دن بھی ضائع ہوا۔ لاہور واپس جا کر جمیل صاحب کو بتاؤں کہ میاں وہاں کوئی انور سدید ایکسین ہے ہی نہیں۔ اتنے میں وہی صاحب چھتری لگائے کمرے سے باہر آئے انہوں نے مجھے دیکھ کر پوچھا کیوں صاحب نہیں ملے نا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اب تک اس نام کا کوئی ایکسین یہاں نہیں آیا۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ ان سے کیا کام ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں کاتب ہوں مکتبہ عالیہ لاہور سے آیا ہوں۔ انہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے اس کا مسودہ ان سے لینا ہے۔ ان کی ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ شاید وہ چپراسی ہو۔ وہ صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر ساتھ والے آدمی سے کہا۔ ان کو میاں انوارالدین کی کوٹھی کا راستہ بتا دو۔ وہی کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں وہاں سے شاید انور سدید صاحب کا کچھ پتہ لگ جائے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ ایک دوسری سڑک پر پہنچ کر اس نے اونچے

اونچے درختوں کی قطار دکھا کر کہا آخر میں کوٹھی پر جا کر معلوم کر لیں۔

شدت کی گرمی چلچلاتی دھوپ، پسینہ اور پیاس سے برا حال وہاں پہنچا۔ برامدے میں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ نسوانی آواز آئی کون ہے؟ میں نے کہا۔ انور سدید صاحب کا یہی مکان ہے؟ وہاں سے تو کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ برامدے میں بغلی دروازہ کھلا۔ آپ ادھر آئیے۔ میں نے السلام علیکم کے بعد کہا۔ مجھے انور سدید صاحب سے ملنا ہے۔ فرمایا۔ میں ہی ہوں۔ یہ سنکر جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے ان کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ اتنے میں ٹھنڈا مشروب آ گیا۔ شربت پی کر کچھ سکون آیا تو میں نے تمام سرگزشت سنائی۔ فرمایا۔ دراصل میرا نام انوار الدین ہے۔ انور سدید میرا قلمی نام ہے محکمہ کے لوگ میرے قلمی نام سے واقف نہیں۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی معذرت چاہتا ہوں۔ کھانے کے لیے پوچھا۔ میں نے عرض کیا۔ میں گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا اب اشتہا نہیں ہے۔ انھوں نے "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کا مسودہ مجھے دیا۔ فرمایا جب مکمل ہو جائے تو مجھے خط لکھ دیجئے۔ میں منگوا لوں گا۔ میں نے عرض کیا۔ اب تو میں نے آپ کا دفتر دیکھ لیا ہے۔ میاں انوار الدین کو بھی جان گیا ہوں۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔

قارئین! آپنے دیکھا میں نے محکمہ نہر کے انجینیر میاں انوار اور ادیبوں، شاعروں کے انور سدید کس طرح تلاش کیا کتنی محنت اور کوشش سے ڈھونڈ نکالا —— اب اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں نے اس ملاقات کو حقیقت کے خلاف لفاظی کا رنگ بھر کر پیش کیا ہے تو میں معذرت کے عرض کروں گا کہ واقعتاً ملاقات اسی طرح ہوئی تھی۔ اب تو مجھے NAME PLATE دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بقول شاعر ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشش
من اندازِ قدت را می شناسم

سال اقبال کی "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کے بعد ذکر اس پری وش، غالب کے نئے خطوط، ڈاکٹر وزیر آغا کا مطالعہ اور محترم چہرے وغیرہ میرے ہی خامۂ کتابت سے گزر کر طباعت کی منزل کی طرف بڑھے اور آپ کے ہاتھوں تک پہنچے ہیں۔ یہ خدمت اور تعلق جو سالِ اقبال سے شروع ہوا تھا اب تک جاری اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ اس بارہ تیرہ سال کی مدت کے تجربے خوب معلوم ہو گیا کہ جمیل صاحب نے کتنی سچی اور کھری بات کہی تھی: "ہر بڑے اور شریف آدمی کے کچھ حاسد بھی ہوتے ہیں" —— اب جبکہ "اردو زبان سرگودھا" کے انور سدید نمبر کی کتابت کی سعادت بھی مجھے حاصل ہوئی ہے اور انور سدید کی ادبی خدمات پر ان کے محامد و محاسن ہند و پاک کے کتنے بہت سارے ادیبوں نے بیان کر کے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے تو میرا بھی جی اس محفل میں شامل ہونے کے لیے مچلا اور یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر لکھی گئی۔ ع: گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

صبا اکرام

انور سدید کی تبصرہ نگاری

ANDOR GOMME نے اپنے مضمون "CRITICISM AND THE READING PUBLIC" میں تبصرہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ تبصرہ ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے بیشتر لوگ بیشتر کتب بلکہ کسی بھی کتاب تک رسائی حاصل کرتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ وہ ادب کا بدل بنتا جا رہا ہے اور تنقیدی معیار کو مجروح کر رہا ہے۔

HENRY JAMES نے تو صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ تبصرہ نگاری اور فنِ تنقید کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ اُس نے اپنے مضمون "CRITICISM" میں جو MORRIS ROBERTS کی کتاب "THE ART OF FICTION" میں شامل ہے، تبصرہ کو تنقید کا DUMMY قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ادبی رسالے اس ٹرین کی طرح ہیں جس کی خالی سیٹوں پر جب مسافر موجود نہ ہوں تو یہ DUMMIES یعنی بیجان پُتلے بٹھا دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تبصرے کے اس بے جان پُتلے کو نہ صرف زبان عطا کی ہے بلکہ سوچنے سمجھنے کی قوت سے بھی نوازا ہے۔ اس لیے ان کے تبصرے تعارف کا بے جان آئینہ بن کر کسی کتاب کے صرف ظاہری حُسن کا عکس ہی پیش نہیں کرتے بلکہ تجزیے کی روشنی کی صورت میں اس کے اندر کے ہُنر کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے لیے ان کے تبصروں سے دو اقتباسات پیش کر رہا ہوں:

"اس کتاب کا بیانیہ اس قدر نظر افروز اور خیال انگیز ہے کہ قاری طویل سفرنامے میں کھو کر جب واپس اپنی دُنیا میں آتا ہے تو اسے احساس

ہوتا ہے کہ یہ خوابِ ابوالحسن تو بے حد مختصر تھا۔"
("سفرِ نصیب" - مختار مسعود (اوراق - بہار نمبر ۱۹۸۲ء))

"ان کے انشائیے عصری آگہی کو اشیاء اور مظاہر کے حوالے سے منظرِ عام پر لاتے ہیں اور انسانی سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔ اس کتاب کے موضوعات ـــــ جنگل، موم بتی، کرسی، جال، پسینہ، بادل، ناریل، سورج مقناطیس وغیرہ بظاہر معمولی نظر آتے ہیں، لیکن سلیم آغا نے جب ان کو ٹٹولا تو بیسویں صدی کی عمرانی زندگی کے اَن گنت گوشے ان پر آشکار ہوتے چلے گئے اور یوں ایک ایسی آنکھ کا مشاہدہ ہمارے سامنے آگیا جو درونِ سطح دیکھنے کی کاوش کرتی ہے اور انشائیہ کو ایک فرحت آمیز تجربہ بنا دیتی ہے۔"
("آمنا سامنا" - سلیم آغا قزلباش)
(اوراق سالنامہ ۱۹۸۷ء)

کسی تصنیف کے اندر کا جائزہ پیش کرتے ہوئے حُسن اور خوبی کے ساتھ ساتھ اگر کہیں کوئی عیب یا کمی نظر آجائے تو اس پر پردہ ڈالنے یا اس سے کترا کر نکل جانے کی بجائے انور سدید اسے قاری کے سامنے پیش کرنے کی بے پناہ جرأت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ چاہے وہ کتاب کتنے ہی بڑے ادیب کی کیوں نہ ہو۔ مثال کے لیے ان کے ایک تبصرے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"موضوعات نئے اور فکر انگیز ہیں اور ہندوستانی ادبانے اقبال کی فن کارانہ عظمت کے تخلیقی، جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو نئے قرینوں سے پیش کیا ہے۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اقبال کے فکری پہلو کو اس کتاب میں مناسب جگہ نہیں دی گئی اور یہ بات بجائے خود محلِ نظر ہے کہ اقبال مفکر یا مصلح اسی لیے تھے کہ وہ شاعر تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں اقبال کی ادبی شخصیت کا صرف ایک رخ سامنے آتا ہے اور دوسرا رُخ جو اہلِ پاکستان کی نظر میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے نظر سے پوشیدہ رہتا ہے۔"
("اقبال کا فن" - گوپی چند نارنگ)
(اوراق - شمارہ جولائی/اگست ۱۹۸۴ء)

انور سدید چونکہ خود ادب کو ایک سنجیدہ فعل سمجھتے ہیں لہٰذا اس کو برتنے کے سلسلے میں وہ ہمیشہ فہم و ادراک کا دامن تھامے رکھنے کی وکالت کرتے ہیں اور اگر کسی زیر تبصرہ تصنیف میں کوئی مصنف غیر ادبی حربے اور غیر شائستہ زبان کے استعمال کا مرتکب نظر آجاتے تو پھر اس کے ساتھ ہرگز رعایت نہیں برتتے اور اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں مگر ایسا کرتے ہوئے وہ کبھی ہذیان سرائی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ منطقی طرزِ استدلال کو اپنائے رکھتے ہیں۔ اس کی مثال وارث علوی کی کتاب "حالی، مقدمہ اور ہم" پر ان کے تبصرے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے وارث علوی کو جب حالی کے بارے یہ کہتے دیکھا کہ ——— "حالی نے لنگوٹی پر پھاگ کھیلا" یا یہ کہ "وہ ان لوگوں میں نہیں جو پجامے پر بنیان پہنے .... نمائش کرتے ہوئے آپ سے ملاقات کرتے ہیں" تو علوی کے غیر سنجیدہ انداز پر غصہ تو آیا ہی مگر ساتھ ہی اس بات پر انہیں تکلیف بھی ہوئی کہ حالی خود اپنے دفاع کرنے والوں کے ہاتھوں قتل کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے علوی کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کرتے ہوئے وہ حق بجانب نظر آتے ہیں:

> " انہوں نے (وارث علوی نے) قلم کے بجائے خاردار جھاڑی تھام رکھی ہے اور قاری کی توجہ ادب کی جانب منعطف کرانے کے بجائے اسے ادب سے بھگانے کی کاوش کر رہے ہیں۔"
>
> ("حالی مقدمہ اور ہم" - وارث علوی)
>
> (اوراق - شمارہ اپریل مئی ۱۹۸۴ء)

چونکہ ڈاکٹر انور سدید کا شمار اُردو کے ان چند ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ادب کے مطالعے کو اپنی زندگی میں ROUTINE بنایا ہوا ہے اور ادب میں تمام سرگرمیوں اور ہر پیش رفت سے خود کو باخبر رکھتے ہیں۔ لہٰذا جب کسی قابلِ ذکر ادیب کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس ادیب کا پورا ادبی کیریئر ان کی نظر میں ہوتا ہے اور قاری کو تبصرہ پڑھ کر اس صنف میں مصنف کے مزید کارہائے نمایاں کا اندازہ ہو جاتا ہے اس نوع کے ایک تبصرے سے اقتباس نقل کر رہا ہوں:

"........ ایک طویل عرصے تک اس خیال کا اظہار کیا جاتا رہا کہ جدید اُردو افسانہ نقاد اور تنقید دونوں سے محروم ہے۔ شہزاد منظر کا شمار اُن نقادوں میں کرنا چاہئے جنھوں نے نہ صرف اس چیلنج کو قبول کیا بلکہ افسانے کی پُرانی روایت کو جدیدیت کی روایت سے ہم رشتہ کر کے اس پورے ارتقا کا مطالعہ مکمل کر دیا۔"

("جدید اُردو افسانہ" ۔ شہزاد منظر)

(اوراق ۔ سالنامہ ۱۹۸۲ء)

کلیم الدین احمد نے اپنے مضمون " اُردو میں تبصرہ نگاری" میں لکھا ہے کہ ———— "تبصرہ کا مقصد ہے کسی کتاب کے جوہر کا پتہ لگانا اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اور جو کچھ کہا جائے اس سے کتاب کی اہم ترین خصوصیتیں (خوبیاں اور برائیاں) دونوں واضح ہو جائیں ...." اور اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اگر اُردو رسالوں میں لکھے جانے والے تبصروں پر نظر ڈالی جائے تو شمس الرحمٰن فاروقی اور کلام حیدری وغیرہ کے علاوہ انور سدید ہی ایسے ادیب نظر آتے ہیں جن کے تبصروں میں یہ خوبی موجود ہے اور عالمانہ شان جھلکتی ہے اور جو کسی تصنیف کے بارے میں کوئی آزاد رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں — ورنہ عام طور پر رسالوں میں جو تبصرے لکھے جا رہے ہیں انھیں دیکھ کر تو کلیم الدین احمد ہی کا قول دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ " تبصرہ نگار تیسرے درجے کے لکھنے والے ہوتے ہیں۔"

شہزاد منظر

انور سدید اور فکشن کی تنقید

ایسے ادیب جو ہمہ جہت ہوتے ہیں اور بیک وقت کئی اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کرتے ہیں ان کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی شناخت ہوتا ہے۔ ایسے ادیب کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ اصل میں ہے کیا؟ اُردو میں کسی ادیب کا کثیر الجہات ہونا عیب تصور کیا جاتا ہے، جبکہ بنگلہ اور فرانسیسی ادب میں اسے خوبی تصوّر کیا جاتا ہے بلکہ کسی ادیب کا ہمہ جہت ہونا اس کے جینئس کا ثبوت ہوتا ہے۔ مثلاً فرانسیسی زبان میں اگر کوئی ادیب، افسانہ نگار اور ناول نویس ہے تو ساتھ ہی ڈراما نگار، ناقد، اوپیرا نگار، فلسفی اور سیاست داں بھی ہے۔ مثلاً رومان رولاں۔ آندرے مالرو۔ سارتر۔ کامو اور فراں سوا ساگاں وغیرہ۔ دراصل ان زبانوں کی اپنی اپنی روایت ہے۔ بنگلہ ادب میں ٹیگور، نذرالاسلام اور بودھ دیو بوس اور لاتعداد ادیبوں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں اس کے برعکس اُردو میں دو چار ہی ایسے مصنفین ہیں جنھیں کثیر الجہات کہا جا سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ صنف پر طبع آزمائی کرنے کی اصل وجہ کیا ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ اپنے تشخّص کی تلاش ہے۔ مصنّف کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا اصل میدان کون سا ہے؟ انور سدید کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے انھوں نے اپنے کیریر کا آغاز افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا اور وہ شاعری، تنقید، انشائیہ اور کالم نگاری کی جانب نکل آگئے۔

میں نے اظہار خیال کے لیے ان کی فکشن کی تنقید کو منتخب کیا ہے، اس لیے کہ ان کے ادبی کیریر کے اس پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے (بلکہ بعض لوگوں کو تو یہ بھی

یاد نہیں کہ انہوں نے اُردو افسانے بارے میں کتنا کچھ لکھا ہے) انور سدید بنیادی طور پر افسانہ نگار رہیں۔ انہوں نے اپنے کریر کی ابتدا افسانہ نگار کی حیثیت سے کی تھی۔ پھر وہ محمد حسن عسکری کی طرح تنقید کی جانب نکل آئے اور اس طرح وہ تنقید کے ہو کر رہ گئے اور ان کے لیے افسانہ نویسی کی جانب لوٹنا ممکن نہ ہوا۔ وہ اسی کے ساتھ افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی مضامین لکھتے رہے لیکن خود کو محض فکشن کی تنقید تک محدود نہیں رکھا۔ حالانکہ فکشن کی تنقید کا میدان بالکل خالی تھا اور وہ اس میدان میں کارنامے انجام دے سکتے تھے، لیکن اُردو میں فکشن کی تنقید کبھی درخورِ اعتنا نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وقار عظیم جیسے ناقد کو بھی آخری ایام میں شاعری کی تنقید و تنقید کی جانب توجہ دینی پڑی اور فکشن کی تنقید یتیم رہ گئی۔

انور سدید نے دوسری اصناف، مثلاً شاعری، انشائیہ نگاری، طنز و مزاح اور سفرنامہ نگاری کی جانب توجہ دینے کے باوجود دوسرے ناقدین کی طرح فکشن کی تنقید سے بے اعتنائی نہیں برتی اور اس بارے میں جو کچھ لکھا اس کی تعداد کم نہیں ہے۔ اُردو فکشن پر لکھے ہوئے ان مضامین کے کم سے کم دو ضخیم مجموعے شائع ہو سکتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ انور سدید کے قارئین کو اس کا بہت کم علم ہے۔ انور سدید مختلف اصناف اور موضوعات پر اس قدر لکھتے رہتے ہیں کہ ان کے قارئین کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ فکشن کے نقاد بھی ہیں اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ افسانے اور افسانہ نگاروں سے متعلق ان کے مضامین یکجا شائع نہیں ہوئے۔ ان کا ایک مجموعہ "اُردو افسانے کی کروٹیں" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ اگر یہ شائع ہوتا تو ان کے قارئین کو معلوم ہوتا کہ انہوں نے اس میدان میں کیا کچھ لکھا ہے۔

انور سدید نے افسانے کے فن یا اس کے فنی رموز و اسرار کے بارے میں علیحدہ سے بہت کم لکھا ہے۔ لیکن ان کی کتاب "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" میں انھوں نے افسانے کے فن اور اس کے تقاضوں کے بارے میں بہت کچھ قلم بند کر دیا ہے صرف اتنا ہی نہیں اُردو افسانے کی تاریخ سے بھی تفصیل کے ساتھ بحث کی اور جدید افسانہ نگاروں کی بعض خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔

انور سدید، ان ناقدین میں سے ہیں جو علامت نگاری کو منفی رجحان تصور نہیں کرتے

بلکہ علامت کے سلسلے میں واضح شعور رکھتے ہیں۔ انھیں اگر پاکستان میں جدیدیت کے علم برداروں میں شمار کیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کنونشنل افسانے سے اپنے کیریر کا آغاز کرنے کے باوجود انھوں نے روایت پسند ناقدوں کی طرح علامتی افسانے کی مذمّت نہیں کی۔ اس کے برعکس علامت نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۸۴ء میں کراچی میں فکشن گروپ کی طرف سے منعقدہ پہلا افسانہ سیمینار میں انہیں جب ڈاکٹر جمیل جالبی کے کلیدی مقالے "علامتی افسانہ۔ ایک منفی رجحان" کے جواب میں مقالہ لکھنے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے لکھا کہ "علامت سچّے فن کار کے باطن سے پورے تخلیقی ہیجان سے امنڈتی ہے اور اپنے انوکھے پن سے بے رنگ بیانیہ اور معمولی صورت واقعہ میں معنی کی نئی ابعاد روشن کر دیتی ہے اور ہمارے سامنے حقیقت کے نئے اور انوکھے زاویے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ علامت سے مشروط نہیں۔ علامت قاری کا ذہن اس تصوّر کی طرف موڑ دیتی ہے جو عموماً نظر سے پوشیدہ رہتا ہے..... متعدد عناصر کو مربوط کرنے کی سیّال آزادی جتنی علامت نگاری میں دستیاب ہے اتنی تشبیہ، استعارہ یا تمثال میں دستیاب نہیں اور ادیب اس آزادی کو فنّی رعنائی سے استعمال کرنے کی کاوش کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ادیب اس کاوش میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام اور عدم ابلاغ کی بنا پر یہ کاوش تحسین سے محروم رہ جاتی ہے..... مقصود بالذّات نہ ہونے کے باوجود علامت تجربے کے بیان کو بامعنی اور تہ دار بنا دیتی ہے۔ افسانے کی معنوی ابعاد ابھارنے کے لیے اس وسیلے کو اردو ادب میں بھی متعدد مرتبہ کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے۔"

جدید علامت نگاروں کی کھلی حمایت کرنے کے ساتھ ساتھ انور سدید کو ان کی خامیوں کا بھی احساس ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے جعلی افسانہ نگار جدید افسانہ نگاروں کی صف میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ بعض نئے افسانہ نگاروں کے ہاں ابھی فن کا ریاض مکمل نہیں ہوا، لیکن کیا یہ ریاض جدید نظم میں مکمل ہو چکا ہے؟ بلاشبہ بعض افسانہ نگار عرفانِ فن حاصل کرنے سے قبل ہی علامت کے مشکل اور ادق تخلیقی تجربات کرنے لگے ہیں اور وہ حقیقت

کی تہ دار کیفیت کو پوری طرح اجاگر نہیں کر پاتے، لیکن اس بطلان کی زد میں سب افسانہ نگاروں کو شامل کرنا اور علامت نگاروں کے پورے قافلے کو غتر بود کر دینا مناسب نہیں "

جیسا کہ میں سطورِ بالا میں لکھ چکا ہوں۔ انور سدید جدیدیت اور علامتی افسانے کے پُرجوش حامی ہیں چنانچہ انہوں نے جدید علامتی افسانہ نگاروں کی تائید اور حمایت میں بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جو درست نہیں ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :

"نئے افسانہ نگاروں نے روایتی اور آفاقی علامتوں کو استعمال کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ تاہم اس کا زیادہ انحصار نئی اتفاقی علامتوں پر ہے۔ روایتی اور آفاقی علامتیں کثرتِ استعمال سے گھستی چلی جا رہی ہیں۔ ہر چند یہ علامتیں ابلاغ میں معاونت کرتی ہیں، لیکن اب یہ نشان یا نظیر کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ جدید افسانہ نگار اپنے تجربے کو تخلیق میں ڈھالنے کے لیے نئی نئی علامتوں کا متلاشی ہے اور عدم ابلاغ کا باعث افسانہ نگار کا عجز نہیں، بلکہ قاری کی ذاتی بے بسی اور نارسائی ہے جس نے نئی علامتوں کی تفہیم و تعبیر کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ ان پر ذاتی اور نجی علامت کا لیبل لگا کر مزید تفہیم کا راستہ بھی روک دیا ہے"

انور سدید کا خیال ہے کہ جدید افسانہ نگاروں کی نت نئی علامتوں کے عدم ابلاغ کی وجہ قاری کی ذاتی بے بسی اور نارسائی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام قارئین تو درکنار ذہین ترین قارئین (حتّٰی کہ ناقدین تک) ان افسانوں کی تفہیم سے کیوں معذور رہتے ہیں ؟ نئی (نجی) علامات کے پردے میں کہیں نام نہاد جدید (جعلی) علامت نگار اپنے عجزِ بیان کو چُھپا تو نہیں رہے ہیں ؟ انور سدید نے اپنے موقف کی حمایت میں رسالہ "آہنگ" (گیا) افسانہ نمبر کی مثال دی ہے اور کہا ہے کہ جدید افسانہ نگاروں کے تجزیاتی مطالعہ کے دوران کسی بھی نقاد نے عدم ابلاغ کی شکایت نہیں کی۔ اگر انور سدید کی دلیل کو تسلیم کر لیا جائے کہ کسی مروّجہ اور "مقررہ راستوں" پر نہ چلنے والے جدید افسانہ نگاروں نے خود کو ناقدین پر سو فی صد منکشف کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود کو افسانے کے عام قارئین پر منکشف کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جہاں تک "آہنگ" (گیا) میں شامل

علامتی افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کا تعلق ہے مطالعہ کرنے والے زیادہ تر علامت نگار تھے اس لیے انھوں نے اگر ان افسانوں سے اپنے مطلب کا مفہوم نکال لیا تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ میں ایسے افسانہ نگاروں اور ناقدوں کو بھی جانتا ہوں جو روایتی اور کنونشنل افسانوں سے بھی علامات تلاش کرکے اپنی من مانی تشریح کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ناقد چاہے تو ایک ہوشیار وکیل کی طرح بے معنی اور بے مفہوم افسانے اور نظم سے مفہوم نکال کر بہت کچھ ثابت کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جدید/علامتی افسانہ ناقدوں کے لیے لکھا جاتا ہے یا عام قارئین کے لیے۔ اب تو گوپی چند نارنگ جیسے افسانے کے چیمپین بھی افسانے کے "جوہر" پر اصرار کرنے لگے ہیں۔ تخلیقی افسانہ نگاروں کو نئی علامات وضع کرنے کا حق ضرور حاصل ہے، لیکن نئی علامات کا ہماری روزمرہ زندگی اور اس کے تجربات سے تعلق یا مناسبت (RELEVANCE) ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ابلاغ کیوں کر ممکن ہے؟ اور پھر نئی علامات وضع کرنا اور اسے قابلِ ابلاغ بنانا اوسط درجے کے علامت نگاروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ انور سدید خود اعتراف کرتے ہیں کہ بہت سے جدید افسانہ نگار افسانے کا ریاض مکمل کرنے سے قبل لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یعنی علامت نگاری کے رموز و اسرار اور اس کے فن کارانہ استعمال سے واقف ہوئے بغیر "علامت نگار" بن جاتے ہیں۔ ایسے خام شعور اور سہل انگار افسانہ نویسوں کی حوصلہ افزائی کا کیا جواز ہے؟ اُردو میں جتنی بڑی تعداد میں جعلی علامت نگار پیدا ہوئے اس کے پیشِ نظر نئی علامات وضع کرنے کا حق ہر افسانہ نگار کو نہیں دیا جا سکتا۔ انور سدید جیسے جدید افسانے کے علم برداروں کو اس جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

برصغیر جنوبی ایشیا بنیادی طور پر زرعی خطہ ہے، اس لیے ہمارا معاشرہ بھی زرعی معاشرہ ہے۔ ہماری آبادی کی غالب اکثریت کا تعلق دیہات سے ہے۔ اس لیے ادب میں بھی دیہات کی عکاسی فطری امر ہے۔ لیکن افسوس! اُردو ادب، خصوصاً اُردو افسانہ میں دیہات کی عکاسی اور ترجمانی بہت کم ہوئی ہے۔ پریم چند اور ان کے قبیلے کے دیگر افسانہ نگاروں نے دیہی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کی اکثریت کا تعلق شہری متوسط طبقے سے ہے۔ معاشرے میں نئے دور کی تھوڑی بہت جو بھی روشنی پہنچی ہے وہ شہروں میں پہنچی ہے۔

اس لیے تعلیم بھی زیادہ تر شہروں تک محدود رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر افسانہ نگار شہروں سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے زندگی میں کبھی ہل تک نہیں دیکھی۔ ایسی صورت میں ان سے دیہی زندگی کی عکاسی کی توقع عبث ہے البتہ جو افسانہ نگار دیہات سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں بلاشبہ دیہی زندگی اور اس کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی اور اس طرح عوام کے وسیع تر حلقوں کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ اُردو افسانہ کا بہت بڑا موضوع ہے جس کی جانب انور سدید سے قبل کسی ناقد نے توجہ نہیں دی۔ اس کی وجہ ہمارے ناقدین کی روایتی سہل انگاری ہے۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح ہمارے ناقدین بھی ادب میں شارٹ کٹ کے قائل ہیں اس لیے وہ محنت اور جستجو سے کام لے کر کسی اہم موضوع پر کتاب لکھنے کے قائل ہی نہیں۔ "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" ایسا موضوع نہیں کہ قلم اٹھایا اور لکھ ڈالا یہ دراصل ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع ہے جسے لکھنے کے لیے ابتدا سے دورِ حاضر تک کے دیہی پس منظر میں لکھے جانے والے افسانوں کا مطالعہ ضروری ہے جو ہمارے عام اور سہل پسند ناقدین کے بس کی بات نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انور سدید نے اس اہم اور مشکل موضوع پر لکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اسے لکھ ڈالا۔ وہ اگر چاہتے تو اس موضوع پر آسانی سے ڈاکٹریٹ کر سکتے تھے۔ لیکن انور سدید آسان راستہ کے قائل نہیں۔ اسی لیے انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے "اُردو ادب کی تحریکیں" جیسے مشکل موضوع کو منتخب کیا اور اسے لکھ کر ثابت کر دیا کہ اگر لگن اور ادب سے سچا لگاؤ ہو تو وہ مشکل سے مشکل موضوع پر بھی لکھ سکتے ہیں۔

جہاں تک "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" کے موضوع کا تعلق ہے، یہ بہت وسیع موضوع ہے۔ اس پر لکھنے کے لیے بڑی محنت اور مطالعے کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان پتّہ مار کر نہ بیٹھے اور گزشتہ اسّی پچاسی سال کے افسانوی ادب کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کرے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید نے پریم چند سے مرزا حامد بیگ اور غلام محمد سے ایوب جوہر تک کے افسانوں کا بغائر مطالعہ کیا ہے اس کے باوجود ہندوستان اور بنگلہ دیش کے کئی اہم افسانہ نگار چھوٹ گئے ہیں۔ مثلاً شہزاد اختر، زین العابدین، احمد سعدی،

ش، م ساجد اور ذاکر عزیزی وغیرہ ۔ اس خطہ کے جن افسانہ نگاروں کے افسانوں سے بحث کی گئی انھوں نے بعد میں بہت سے اچھے افسانے لکھے ہیں ۔ اس لیے ان کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان کے جن افسانہ نگاروں نے دیہی پس منظر میں عمدہ افسانے لکھے ہیں ان میں قاضی عبدالستار اور محمد اشرف وغیرہ شامل ہیں ۔ اس لیے ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے ۔ توقع ہے کہ اس کتاب کے پاکستانی ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے گا ۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور میں بڑے شاعر ۔ ادیب کے مقلد پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ چنانچہ اُردو افسانے میں بھی پریم چند کے مقلّدین کی تعداد کم نہیں ہے ۔ پریم چند کے بعد جن افسانہ نگاروں کی تقلید کی گئی ۔ ان میں کرشن چندر سرفہرست ہیں ۔ ان کے مقلّدین میں ابراہیم جلیس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ اس لیے کہ ابراہیم جلیس بھی کرشن چندر کی طرح اچھے طنز نگار تھے اور وہ زبان و بیان اور طرزِ نگارش میں بھی کرشن چندر کے بہت قریب تھے ۔ انور سدید نے کرشن چندر کے مقلدوں میں احمد ندیم قاسمی ، پریم ناتھ پردیسی ، ٹھاکر پونچھی ، رامانند ساگر ، پریم ناتھ در اور شمس آغا کو شامل کیا ہے ، حالاں کہ احمد ندیم قاسمی کرشن چندر کے ہرگز مقلد نہیں ہیں ۔ محض دیہی پس منظر میں افسانے لکھنے سے کوئی کسی کا مقلد نہیں ہوتا ۔ دراصل انور سدید نے بڑے ادیب کی تقلید کے ضمن میں پہلے سے ایک مفروضہ بنالیا ہے جس کے مطابق وہ مختلف ادیبوں کو ان خانوں میں فِٹ کر گئے ہیں ۔ سدرشن اور اعظم کریوی وغیرہ کو اگر پریم چند کا مقلّد تسلیم کر لیا جائے تو بھی احمد ندیم قاسمی اور شمس آغا کو کرشن چندر کا مقلّد نہیں کہا جا سکتا ۔ اگرچہ کرشن چند اور احمد ندیم قاسمی نظریاتی اعتبار سے ترقی پسند ہیں ۔ ان تمام اختلافات کے باوجود "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" فکشن کی تنقید میں ایک اہم اور قابلِ ذکر تصنیف ہے ۔

اردو تنقید کا المیہ یہ ہے کہ ناقدین اوّل تو فکشن کے بارے میں لکھتے ہی نہیں اور اگر افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں تو ناول کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ وہ سنہرا دور گزر گیا جب "آگ کا دریا" اور "اداس نسلیں" کے بارے میں ن ۔ م راشد جیسے مصنف تک نے تنقیدی مضامین رقم کئے ۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کاروانِ وجود ، راجہ گدھ

"دشتِ سوس" اور "دیوار کے پیچھے" کے بارے میں سوائے رسمی تبصروں کے کوئی قابلِ ذکر تنقیدی مطالعہ شائع نہیں ہوا۔ انتظار حسین خوش قسمت ہیں کہ ان کے ناول "بستی" کے بارے میں چند مضامین لکھے گئے یا پھر قرۃ العین حیدر کے حالیہ ناول "گردشِ رنگِ چمن" کے بارے میں چند مضامین لکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے برعکس انتظار حسین کے ناول "تذکرہ"[1] اور انیس ناگی کے ناول "میں اور وہ" کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ فکشن کے ضمن میں ہمارے ناقدین کی سوتیلی ماں جیسے سلوک کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو میں اچھے سے اچھا ناول شائع ہونے کے باوجود قارئین کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُردو میں کوئی قابلِ ذکر ناول شائع بھی ہوا ہے یا نہیں۔ اس کی مثال شبیر حسین کے ناول "جھوک سیال" سے دی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف نے جب سنہ کی دہائی میں شائع ہونے والے اُردو ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس ناول کا تفصیل سے ذکر کیا تو ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں کو اس اہم اور قابلِ ذکر ناول کے وجود کا علم ہوا۔

یہ انور سدید کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے طارق اسماعیل ساگر جیسے ناول نگار کو ڈھونڈ نکالا جو کم و بیش نصف درجن ناول لکھنے کے باوجود "خالص ادبی حلقوں" میں ابھی تک غیر معروف ہیں۔ نصف درجن ناول لکھنے والے طارق اسماعیل ساگر کے اُردو ادب کے "خواص" میں غیر معروف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کسی "ادبی ناقد" نے ان کے ناولوں کا نوٹس لینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اور نہ طارق اسماعیل ساگر نے ادبی رسائل میں شائع ہونا ضروری تصور کیا۔ [سوال یہ ہے کہ کیا کسی ناول نگار کا ادبی رسائل میں شائع ہونا ضروری ہے؟ نہ جانے کتنے ناول نویس ناقدین کی عدم توجہی کے باعث بازاری ناول نگاروں کی صف میں شمار کیے جا رہے ہیں۔ کسی ناقد کو کیا پڑی ہے کہ وہ ان ناول نگاروں میں سے "گوہرِ نایاب" دریافت کرتا پھرے؟]

دیگر ناقدین کے برعکس انور سدید کا اس ضمن میں رویہ قطعی مثبت اور حوصلہ افزا ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ ناول نگاروں کا بھی بھرپور مطالعہ کیا اور اس کے بارے میں تفصیلی مضامین لکھے۔ انھوں نے جن ناولوں

---

[1] مقالہ نگار کی یہ بات محلِ نظر ہے۔ (ادارہ)

پر تفصیل کے ساتھ لکھا ان میں "دشتِ سوس" (جمیلہ ہاشمی) "حسرتِ عرضِ تمنا" (فرخندہ لودھی) "میرا گاؤں" (غلام الثقلین نقوی) "نادید" (جوگندر پال) اور "فرار" (ظفر پیامی) وغیرہ۔ انھوں نے ناول اور ناول نگاروں سے بحث کرتے ہوئے سینئر اور مشہور مصنفوں کے ساتھ ساتھ نئے اور کم معروف مصنفوں کے ناولوں پر بھی قلم اٹھایا ہے جیسے سلمیٰ اعوان (تنہا) اکرام بریلوی (پل صراط) اور فیاض ظفر (سمندر کا پانی) وغیرہ۔

انھوں نے بعض ناولوں کے بارے میں اختصار سے اور بعض کے بارے میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن کوئی بھی مضمون رسمی نوعیت کا تبصرہ نہیں ہے۔ بعض مضامین بلاشبہ "مطالعے" کے ذیل میں آتے ہیں جیسے "دشتِ سوس" اور "نادید" وغیرہ کے بارے میں مضامین۔ انور سدید نے "نادید" پر لکھتے ہوئے بلاشبہ نقاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور نہ صرف ناول کے موضوع سے تفصیلی بحث کی ہے بلکہ اس کے اسلوب اور تکنیک پر بھی روشنی ڈالی ہے اور سوال کیا ہے کہ نادید لکھ کر جوگندر پال نے اس صنف کے تموّل میں اچانک اور بے پایاں اضافہ کر دیا ہے لیکن کیا جوگندر پال اس قسم کی نادر تخلیق دوبارہ پیش کر سکیں گے؟ انور سدید نے درست لکھا ہے کہ جوگندر پال نے یہ ناول لکھ کر نہ صرف ایک انوکھا تجربہ کیا ہے بلکہ اس کا تکنیکی عمل بھی نیا اور انوکھا ہے۔ ناول پر لکھے جانے والے انور سدید کے مضامین میں بلاشبہ یہ عمدہ مضمون ہے۔

انور سدید ان ناقدوں میں سے ہیں جو گاہے گاہے کتاب اور صاحبِ کتاب کو دریافت کرتے رہتے ہیں۔ "دریافت" کرنے سے مراد گڑے مردے کو اکھاڑنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کتابوں کی دریافت ہے جو ناقدین کی بے اعتنائی اور عدمِ توجہی کے باعث نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں فرخندہ لودھی کا ناول "حسرتِ عرضِ تمنا" شامل ہے۔ یہ وہ ناول ہے جس سے بقول انور سدید "اہلِ ادب نے دانستہ اغماض برتا اور اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔" انور سدید کا خیال ہے کہ یہ ناول اس کی اشاعت کے پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی پڑھے جانے اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور میں اس زندہ رہنے والے ناول کو ادب کی

گم شدہ کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔"

انور سدید ناول کی تنقید کتنی گہرائی میں جاکر کرتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال غلام الثقلین نقوی کے ناول "میرا گاؤں" کے بارے میں اُن کے مضمون سے ملتی ہے۔ ناول کی تنقید کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ ناول کی کہانی بیان کر دی جائے اور اللہ اللہ خیر صلا۔ اس طرح ناول پر لکھنا بہت آسان ہے۔ ہمارے زیادہ تر ناقدین ناول پر اسی انداز میں مضمون لکھتے ہیں۔ لیکن انور سدید ناول کی تہ تک اتر جانا ضروری تصور کرتے ہیں تاکہ ناول کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکے۔ مثلاً وہ "میرا گاؤں" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ ناول (میرا گاؤں) وقت کے اعتبار سے آزادیٔ برِصغیر سے ذرا پہلے کے زمانے سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ آکر ختم ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا بیانیہ نہیں۔ لیکن اس میں وہ تمام جد و جہد موجود ہے جس سے وطنِ عزیز اس دور میں گزر چکا ہے۔ ایک اور بات یہ کہ نقوی صاحب نے صرف واقعات و حادثات سے ناول کا تانا بانا مرتب نہیں کیا۔ بلکہ اس تغیر کو بھی گرفت میں لیا ہے جو مشین کی گاؤں میں آمد سے رو بہ عمل آ رہا ہے اور پورے گاؤں کی زندگی کا نقشہ بدل رہا ہے۔"

اس طرح انور سدید نے ناول کی تہہ میں اُتر کر ناول کا جائزہ لیا ہے۔

سجّاد نقوی

انور سدید کا اسلوبِ انتقاد

میرے نزدیک اچھی اور کامیاب تنقید کے لیے جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے، ان میں پہلی خوبی یہ ہے کہ موضوع کی مناسبت سے اس کے پیچھے پڑھا لکھا ذہن ہو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ جو کچھ بیان کیا جائے، اس میں خلوص کارفرما ہو اور صاف ذہن کی عکاسی کرے۔ تیسری خوبی یہ کہ بات دلیل سے کی جائے اور اس میں سستی جذباتیت نہ آنے پائے اور آخری خصوصیت یہ کہ اظہار کے لیے سپاٹ اور پھیکے اسلوب کی بجائے تخلیقی اسلوب روا رکھا جائے۔ رہی یہ بات کہ تنقید میں سچائی اور انصاف کے تقاضے ملحوظِ خاطر ہوں، ان اوصاف کے بغیر تو کامیاب اور دیرا ثر تنقید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ "نقد" کا لفظ ہی پرکھ اور میزان کے ہم معنی ہے۔

جس طرح طبائع انسانی کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا نیز ان کے پس منظر کا جُدا جُدا ہونا فطرت کا عین تقاضا ہے، اسی طرح تنقید کے عقب میں ہم کلام ذات کی سوچ کا انداز، طرزِ بیان اور شعور اگر دوسرے سے مختلف ہوگا، تو اسے یقیناً ایک نئی آواز قرار دیا جاسکے گا۔ یہاں بین السطور یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ہر چند ہر عہد میں جملہ فنونِ لطیفہ میں فن کار تو بہت سے ہوتے ہیں، مگر ان میں سے گنتی کے چند ایسے نکلتے ہیں، جنہیں متعلقہ فن کا نمائندہ قرار دیا جا سکے۔ گویا تقلید کی راہ پر گامزن ہونے کا یہ فائدہ مسلّم کہ وقتی طور پر شہرت اور نیک نامی حاصل ہوتی ہے، مگر دوام ان کے ہی حصّے میں آتا ہے جو فطرت کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے لیے ایک الگ راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور نکتے کی وضاحت ہو جائے، وہ یہ کہ جو لوگ جدت کو بغاوت کے ہم معنی قرار دیتے ہیں، وہ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ روایت جدت کے برعکس ہونے کا نام نہیں ہے، بلکہ روایت

کے معانی صالح اقدار کے احترام اور تحفظ کے ہیں، لہٰذا حقیقی جدّت وہ ہوگی، جو روایت سے انحراف نہیں کرے گی، بلکہ اس کی راہنمائی میں نئے افق کی جانب گامزن ہوگی۔

مذکورہ بالا سطور کی روشنی میں اگر اُردو تنقید کا جائزہ لیں، تو ہم دیکھیں گے کہ صرف انہیں ناقدینِ ادب نے زندہ رہنے والی تنقید لکھی ہے، جن کے یہاں فنِ تنقید کی جملہ خوبیوں کے علاوہ جدّت کے ساتھ ساتھ روایت کا احترام بھی موجود تھا۔ متقدّمین میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولانا شبلی اور مہدی افادی، متوسطین میں احتشام حسین، آلِ احمد سرور، وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، محمد حسن عسکری، ریاض احمد اور احسن فاروقی، اور زمانہ حال میں ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل جالبی، سہیل بخاری، سلیم احمد، سعداللہ کلیم اور انور سدید چند اہم نام ہیں۔ ان کے علاوہ اس عہد میں جمیل آذر، تبسم کاشمیری، رشید نثار، مشتاق قمر، محمد علی صدیقی، سید مہدی جعفر، شمس الرحمٰن فاروقی، غلام حسین اظہر، رشید امجد، اور مرزا حامد بیگ کی تنقیدی تحریریں بھی پتہ دیتی ہیں کہ وہ بھی بڑی عمدہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

ناقدین کے اس سرسری ذکر کے بعد میں گزشتہ دو دہائیوں کے سب سے زیادہ فعال نقّاد انور سدید کی تنقید کا ایک مجمل سا جائزہ پیش کرتا ہوں۔ میں نے انور سدید کو بیس برس کا سب سے زیادہ فعال نقاد اس لیے کہا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے اور کیفیت کے اعتبار سے جتنے تنقیدی مضامین اس نقاد نے پیش کیے ہیں، اس ضمن میں مشکل سے اس کا کوئی حریف ہو سکتا ہے۔ پھر موضوع کلاسیکی ادب اور اس کی جملہ اصناف ہو یا جدید ادب اور عصری مسائل اُردو ادب کا ہر دیانتدار طالب علم اس بات کی شہادت دے گا کہ انور سدید ہی وہ واحد نقاد ہے جس نے نہ صرف ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے، بلکہ اس سے پورا پورا انصاف بھی کیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ جو کچھ لکھا ہمیشہ اس کے پیچھے ایسا ذہن کار فرما رہا جو واضح نقطۂ نظر کا حامل اور ادبی صداقت کا جویا تھا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو انور سدید سے شدید اختلافی نظریات رکھنے والے ادبا کو بھی بسا اوقات دبی زبان میں گاہے گاہے کھلے بندوں اپنی حقانیت تسلیم کروانے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں گزشتہ دو دہائی کے دوران شائع ہونے والے ادبی رسائل اور اخبارات کے ادبی ایڈیشن ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں کہ ان میں جو نام تواتر سے دیکھنے کو ملے گا، وہ انور سدید کا ہوگا۔ ان شواہد کی روشنی ہی میں اگر مجھے انور سدید اس

عہد کا فعال ترین نقاد نظر آتا ہے، تو اس میں مبالغے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

انور سدید کے تنقیدی سفر میں مجھے جس بات نے بے حد متاثر کیا ہے، وہ اس کے فن کا مسلسل ارتقا ہے۔ اس کی غالباً یہ وجہ بھی ہے کہ وہ ادیب کے کسی سیاسی نظریے یا ازم سے وابستگی کو ادب اور ادیب دونوں کے لیے نقصان دہ تصور کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی ادیب کسی خاص مسلک سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہے، تو گویا وہ اپنی فکری اور تخلیقی ترقی کے سامنے خود اپنے ہاتھ سے ایک بند سا تعمیر کر لیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ادیب تو وسیع النظری اور انسانی آزادی کا سمبل ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ اپنے نظریے کے قلعے میں اپنی ذات کو محبوس کر لیتا ہے، تو اس کی تخلیقی رَو ایک خاص مقام سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ انور سدید نے اپنی فکری اور تخلیقی صلاحیت کو کبھی بھی سنگلاخیت کی نذر نہیں ہونے دیا، بلکہ اس کے فطری بہاؤ کو اپنے روز افزوں مطالعے سے تیز سے تیز تر ہونے کی اہلیت اور توانائی عطا کی ہے۔ انور سدید تنقید کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے ایک مدت تک افسانے لکھتا رہا اور خوبی کی یہ بات کہ اس دور کے اُن ادبی رسائل میں چھپتا رہا، جن میں چھپنا کسی ادیب کی ثقاہت اور قد آوری کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ میری مراد "مخزن"، "ہمایوں" اور "عالمگیر" سے ہے۔ پھر جیسے جیسے ایک ایک کر کے یہ رسائل ادبی دُنیا سے رُخصت ہوتے گئے، انور سدید بھی دھیرے دھیرے گمنامی کی چادر میں لپٹتا چلا گیا اور پھر وہ تاریخی وقت بھی آیا جس کی تفصیل ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"آج سے تقریباً سات برس قبل جب میری انور سدید سے تفصیلی ملاقات ہوئی، اور میں نے ادب اور ادیب کے بارے میں ان کی جچی تلی آرا سُنیں اور ہر رائے کے عقب میں مجھے اُن کے خلوص، منصفانہ رویّے اور وسیع مطالعے کا احساس ہوا، تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف متوجہ ہوں۔ بات چونکہ دل سے نکلی تھی، اس لیے اس نے قاعدے کے مطابق فی الفور اثر کیا اور چند ہی روز کے بعد انہوں نے ایک بے داغ مسودہ میرے سامنے رکھ کر اپنی مخصوص ملائمت اور انکساری سے مجھے بتایا کہ انہوں نے محض ارشاد کی تعمیل میں یہ چند بے ربط سطریں لکھی ہیں، ورنہ تنقید ان کا میدان نہیں ہے۔" مضمون پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔

کہنے کو تو یہ ان کا پہلا تنقیدی مضمون تھا، مگر وہ آنِ واحد میں اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں ناقدانِ کرام سالوں کی جانفشانی اور خجالت کے بعد پہنچتے ہیں۔ جب یہ مضمون چھپا تو احباب نے میری اس رائے کی توثیق کی اور یہ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوبِ نگارش پر پہلا وقیع مضمون قرار پایا۔" ؎

گویا یہ مضمون ابھی انور سدید کے عشق کی ابتدا تھی اور بقول وزیر آغا عشق بھی وہ جو کوہِ آتش فشاں کے لاوے کی طرح زمین کے سینے کو پھاڑ کر چشم زدن میں باہر آتا اور خس و خاشاک کو بہالے جاتا ہے۔" اس انداز سے انور سدید کا ادب میں دوبارہ ورود ہوا اور پھر قارئین نے دیکھا کہ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوبِ نگارش پر مضمون بارش کا وہ پہلا قطرہ تھا جو انور سدید کے قلم سے ٹپکا۔ بعد میں تو مضامین کی برکھا ہی اُمڈ آئی اور ابھی تک برسے چلی جا رہی ہے۔ عام طور پر ادیب کا زُود نویس ہونا اس کے فن کے لیے اچھا شگون تصور نہیں کیا جاتا۔ یہ بات اُن پر تو صادق آتی ہے جو ادب پیشہ ہیں، لیکن جو شخص محض اپنے اندر کے انسان کو مطمئن اور آسودہ کرنے کی خاطر لکھتا ہو، اس کے لیے زُود نویسی بجائے خامی کے اس کی ضرورت بن جاتی ہے۔ لکھنا انور سدید کی باطنی طلب ہے، اور طلب جب شدت اختیار کر جائے تو وقتی تسکین کے لیے اظہار کا وسیلہ چاہتی ہے، لہٰذا انور سدید اسی تسکین کی خاطر موضوع علمی ہو یا ادبی، بے تکان لکھتا چلا جاتا ہے، مگر پھر بھی پیاسا کا پیاسا نظر آتا ہے۔ چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے شوق کے مراحل طے ہونے میں نہیں آتے۔ انور سدید ایسے ہی کارواں کا ایک فرد ہے اور اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر ہے

گو سفر دشوار تھا، لیکن تمنا ساتھ تھی
جو قدم اٹھا وہ منزل کا نشاں بنتا گیا!

بات انور سدید کے تنقیدی سفر اور فنی ارتقاء کی ہو رہی تھی۔ اس سفر میں مولانا پر مضمون اگر انور سدید کا زمانی اعتبار سے پہلا قدم تھا، تو اس کے پہلے مجموعۂ مضامین "فکر و خیال" کے حوالے سے گفتگو کی جائے، تو اس مجموعے کا ہر مضمون پہلے سے آگے کا قدم دکھائی دیتا ہے،
مگر میرے خیال میں اس مجموعے کے دو مضمون

؎ اختلافات - دیباچہ از ڈاکٹر وزیر آغا

ایسے ہیں جو فکر و فن کے اعتبار سے اس قدر اوریجنل اور تازہ ہیں کہ انہیں بلا شک و شبہ انور سدید کے فنی ارتقا میں سنگ ہائے میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری مراد اس کے مضامین "اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" اور "اُردو ادب کی چند فکری تحریکیں" سے ہے۔ اوّل الذکر مقالہ دیہات اور اس کے پس منظر میں لکھے جانے والے شاہکار افسانوں اور نمائندہ افسانہ نگاروں کا نہ صرف از سرِ نو ادبی مرتبہ متعین کرتا ہے، بلکہ ان چھپے ہوئے گفتنی اور ناگفتنی گوشوں کی بھی پہلی مرتبہ نقاب کشائی کرتا ہے کہ آئینہ میں اصل تصویر اپنے حُسن و قبح کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس مقالے میں جہاں انور سدید نے تحقیق اور تنقید کا نہایت حسین امتزاج پیش کیا ہے، وہاں افسانے کی مناسبت سے مقالے کی بُنت میں ایسے افسانوی موڑ پیدا کیے ہیں کہ قاری کو وہ جمالیاتی حظ بھی میسر آتا ہے، جو ایک شاہکار افسانہ پڑھ کر ہی ممکن ہو سکتا ہے یہ مقالہ چھ نمائندہ افسانہ نگاروں کی معیت میں اپنا فنی سفر مکمل کرتا ہے۔ ان میں میرِ کارواں پریم چند ہے۔ سفر کی ابتدا میں وہ اکیلا ہے، مگر بعد میں زمانی اعتبار سے، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی، صادق حسین اور جمیلہ ہاشمی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اس کارواں میں شریک ہو جاتے ہیں دلچسپ بات یہ کہ انور سدید نے ادبی شخصیات کے اندر جھانکنے کے بجائے ان کی تحریروں سے ان کے اندر کے انسان کو اپنے تمام تر حُسن و قبح سمیت دریافت کرنے کی ایک کامیاب سعی کی ہے۔ میرے خیال میں اگر انور سدید نے اب تک یہی مقالہ لکھا ہوتا تو یہ اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے کے بعد اب تک اس موضوع پر جتنے بھی مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں کہیں تو اس مقالے کا کھلے بندوں حوالہ ملتا ہے اور جہاں حوالہ موجود نہیں ہے، تحریر خود چغلی کھاتی ہے کہ اس پر بلا واسطہ اس مضمون کے اثرات ہیں۔ "فکر و خیال" کا دوسرا مضمون "اُردو ادب کی چند فکری تحریکیں" انور سدید کے فنی سفر کا ایک اور اہم قدم بنتا ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ مختصر ہے، مگر اس کے عقب میں انور سدید کا اُردو علم و ادب کا وسیع مطالعہ قدم قدم پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ چند صفحوں میں وَلی کے عہد سے لے کر علامہ اقبال اور علامہ سے لے کر ڈاکٹر وزیر آغا کے زمانے تک فکر کے دبستانوں کا اس انداز سے جائزہ پیش کرنا کہ ہر فکری تحریک اور دبستان اپنے سیاق و سباق سے نمایاں ہوتا جائے، اگر ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور تھا اور پھر جب اس موضوع پر نہ مشرق میں نہ مغرب میں کوئی نمونہ موجود ہو، ایسی صورت میں اَن گنت کتب میں سے اردگرد بکھرے کوائف کو یک جا کرنا ورق ورق کی شیرازہ بندی سے کم محنت طلب کام نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر اس

دوربیں نگاہ کی ضرورت تھی کہ جس کی راہنمائی کے بغیر ایک واضح سوچ کا حامل مقالہ کامیاب تحقیقی اظہار کی صورت اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مقالہ ان مراحل سے نہ صرف حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ گزرا ہے، بلکہ انور سدید کے لیے ڈاکٹریٹ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا ہے۔ اس مضمون نے بھی اُردو ادب پر دیرپا اثرات مرتسم کیے ہیں اور یہی ایک زندہ تحریر کا مابعد الامتیاز ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے اذہان کو اس طور پر متاثر کرتی ہے کہ اس کی بازگشت معاصر تحریروں میں بھی گونجتی دکھائی دیتی ہے۔

اگر "فکر و خیال" کو انور سدید کے فنی ارتقاء میں پہلی منزل قرار دیا جائے، تو "اختلافات" اس کی دوسری منزل قرار دی جائے گی۔ "فکر و خیال" سے "اختلافات" تک پہنچتے پہنچتے انور سدید دائرہ در دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔ "فکر و خیال" میں اگرچہ بھاری بھرکم مضامین تھے، تو "اختلافات" میں پھیلتے پھیلتے سولہ کی تعداد تک پہنچ گئے ہیں اور اگر مضامین کے اختصار کو سامنے رکھیں، تو "اختلافات" میں پھیلاؤ کی نسبت سمٹنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ تھوڑے لفظوں میں بڑی بات کہنا ان مضامین کی نمایاں خصوصیت ہے اور پھر تنوع کا یہ عالم ہے کہ زبان، ادب، تاریخ، ابلاغ، جدیدیت، انشائیہ، تنقید، صحافت، نظم، سوشلزم اور رُوحِ عصر کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جسے انور سدید نے اپنی مخصوص نئی سوچ کے ساتھ نہ چھوا ہو۔

انور سدید کے فنی ارتقاء کے ضمن میں مجھے اس مجموعے کے دو مقالوں نے بطورِ خاص متاثر کیا ہے۔ ایک "ممتاز شیریں کی تنقید" اور دوسرا "اُردو نظم میں صنفِ نازک کے جنسی رجحانات"۔ اول الذکر مقالہ میں مصنفہ کی اکلوتی تنقیدی تصنیف "معیار" کو پیشِ نظر رکھ کر انور سدید نے پہلی مرتبہ ممتاز شیریں کا تنقید میں مرتبہ متعین کیا ہے۔ ممتاز شیریں، منٹو اور محمد حسن عسکری کے پاکستانی ادب کے نظریے کی مؤید اور ہم نوا تھیں اور جیتے جی اُردو تنقید میں وہ مقام نہ حاصل کر سکیں، جو اب انور سدید کی صداقتِ تنقید نے مہیا کیا ہے۔ جس ژرف نگہی اور ادبی خلوص سے انور سدید نے مرحومہ کے مضامین کا جائزہ لیا ہے اس کے لفظ لفظ سے خلوص و عقیدت کا آبِ حیات ٹپکتا ہے۔ دوسرا مضمون اُردو نظم میں صنفِ نازک کے جنسی رجحانات سے متعلق ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ مضمون نہ صرف نیا ہے، بلکہ نظموں کے حوالے سے شاعرات کے شعری باطن کا تجزیہ اس انداز سے پہلے کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس مقالے میں موضوع کی ندرت اور اذہان کو متحرک کرنے کی صلاحیت دو ایسی خوبیاں ہیں جو انور سدید سے پہلے اس نوع کی لکھی تحریروں سے اسے الگ سی بُو باس اور انفرادیت عطا کرتی ہیں۔

انور سدید کے فنی ارتقا میں "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کو تیسری منزل کی حیثیت حاصل ہے گویا تصوف کی زبان میں طالبِ حُسن نظر اور حیرت کے مقامات سے گزر کر اس منزل پر پہنچ گیا ہے جسے جذب اور بیخودی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے تین اہم مضمون اقبال کی تحریک، مخزن اور رومانیت' اور اقبال کے کلاسیکی نقوش" ایک ہی کیفیت کے تین نام ہیں اور یہ کیفیت بے خودی کی ہے کہ جس میں طالب خود فراموشی کے عالم میں بھی مطلوب کے روبرو کھڑا ہے۔ شہادت کے طور پر انور سدید کا یہ بیان دیکھیے جو کتاب کے آغاز میں اُس نے 'روبرو' کے عنوان کے تحت دیا ہے:

"اقبال سے میری اوّلین ملاقات تو طفولیت کی بیداری سے بھی شاید قبل ہوئی۔ کیفیت اس اجمال کی یہ ہے کہ میرے والدِ گرامی شب بیداری کے لیے اُٹھتے، تو مثنوی مولانا رومؒ کے ساتھ اکثر اقبال کا کلام بھی پڑھتے۔ ان کی زیرِ لب آوازرات کے سناٹے میں گونج تو پیدا نہ کرتی، تاہم مجھے اکثر سوتے سے جگا دیتی۔ میں دیکھتا کہ والدِ گرامی اقبال کے اشعار پڑھ رہے ہیں اور مسلسل رو رہے ہیں۔ درمیان میں کبھی وقفہ آجاتا تب بھی وہ چپ نہ ہوتے؛ بلکہ سسکیاں لیتے رہتے۔ اس زمانے میں والدِ گرامی کی آواز کا تعاقب کرنے لگا، تو اقبال کے بہت سے اشعار زبان پر جاری اور قلب میں پیوست ہو گئے۔"

گویا ان مضامین کی تخلیق کے پیچھے انور سدید کا وہ بھرپور جذبۂ عشق کارفرما ہے جو اسے علامہ اقبال سے ہے جس کا بیج تو انور سدید کے والدِ گرامی نے اور اس کی نشوونما مشرق و مغرب کی علمی و ادبی کُتب کے مطالعے نے فراہم کی تھی۔

ان مضامین کی دوسری سطح علمی اور تنقیدی ہے۔ اس سطح پر انور سدید نے علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے ان کے فکری ارتقا کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ تینوں مضمون الگ الگ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں، مگر ان کے بیچوں بیچ ایک فکری لکیر از خود بنتی انہیں مربوط بھی کرتی جاتی ہے۔ گویا باطنی سطح کی طرح ان مضامین کی حیثیت بھی 'کُل کے اجزا' کی سی ہے۔ "اقبال کی تحریک" میں جہاں انور سدید نے برصغیر پاک و ہند کے وسیع تاریخی، سماجی اور فکری پس منظر میں سرسید کو ایک توانا فکری آواز بنا کر اُبھارا ہے، وہاں اُس نے اقبال کو سرسید سے آگے کا قدم قرار دیا ہے۔ اس سے اگلے مضمون 'رومانیت، مخزن اور اقبال' میں انور سدید نے برصغیر پاک و ہند میں علمی اور ادبی سطح پر

مغربی افکار کی یلغار کے نتیجے میں ادب بالخصوص شاعری پر ان کے اثرات کا تجزیہ کرنے کے بعد بتایا کہ علامہ اقبالؒ نے اس سب کے باوجود اپنی منفرد مشرقی سوچ کو برقرار رکھا ہے۔" اقبالؒ کے کلاسیکی نقوش" کا دائرۂ عمل خالصتاً علمی و ادبی ہے۔ اس میں جہاں انور سدید نے کلاسکیت اور رومانیت سے الگ الگ بحث کی ہے، وہاں اس نے اس تضاد کو مٹانے کی بھی پُرخلوص کوشش کی ہے جو عام طور پر ان دونوں میں تصور کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں یوں تو اور بھی چند فکر انگیز مضامین ہیں اور سب کے سب انور سدید کی منفرد سوچ اور تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، لیکن انور سدید کے تنقیدی ارتقا میں ان تین مضامین کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔

مضمون کے آغاز میں جہاں مَیں نے کامیاب تنقید کے لیے چند خوبیوں کا ذکر کیا تھا، وہاں اسلوب کو بھی ایک اہم خوبی قرار دیا تھا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو کسی تحریر کے ادبی اور تخلیقی ہونے کا معیار ہی اسلوب ٹھہرتا ہے، یہاں اس مغالطے کا بھی ازالہ ہو جائے کہ جو لوگ تنقید کو تخلیق سے کوئی الگ شے تصور کرتے ہیں، وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جب کسی تحریر کو ادب سے منسلک کیا جاتا ہے تو وہاں صرف ایک ہی کسوٹی کام دیتی ہے اور وہ اسلوب کی کسوٹی ہے۔ اگر تو اسلوب ادبی اور تخلیقی ہے تو خشک سے خشک موضوع کو بھی اپنے رنگ میں رنگے گا اور اگر اس کے برعکس غیر تخلیقی اور سپاٹ ہے تو اچھے بھلے جیتے جاگتے اور مترنم موضوع کو بھی صحافت کی سطح پر کھینچ لائے گا۔ اسلوب کے اس فرق کو ایک عام سی مثال میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں کہ جب ہم کسی دوست کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھتے ہیں، تو اس سے ہمارا پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ بھائی کیسی ہے؟ اگر تو اسے وہ کتاب پسند ہے، تو جواب میں وہ صرف یہ کہتا ہے کہ بھائی! اس کتاب کا کہنا شروع کریں، تو اسے ختم کیے بغیر چھوڑا نہیں جا سکتا اور اس کے برعکس اگر وہ کتاب اُسے ناپسند ہے، تو بیزار لہجے میں کہتا ہے "یار کیا پوچھتے ہو، اس کے ساتھ تو چند صفحوں سے آگے نہیں چلا جاتا۔" گویا اس مثال سے واضح ہوا کہ اسلوب ہی وہ بنیادی صفت ہے جو تخلیقی ہونے کی صورت میں کسی کتاب کو قبولیت اور غیر تخلیقی ہونے کی صورت میں عدم قبولیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ رہا موضوع کا چھوٹا بڑا ہونا، یہ ایسی اہم بات نہیں، بلکہ اہم بات تو فنکار کا اسلوب ہی ہے جو چاہے تو بڑے موضوع کو چھوٹا اور پست بنا دے یا چھوٹے کو ارفع اور بلند کر دے۔

ان معروضات کی روشنی میں دیکھیں تو انور سدید کی تنقید کی اثر آفرینی کا تمام تر انحصار اس کے

تخلیقی اسلوب کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اسلوب اکتسابی نہیں، وہبی ہے اور تنقید کے میدان میں آنے سے بہت پہلے انور سدید کا افسانہ نگاری کے سفر میں فنی پختگی کے بہت سے مراحل طے کر چکا تھا۔ اسی لیے تو جب ہم انور سدید کے اوّلین مضمون "مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب" کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مضمون کے آغاز سے انجام تک اس کے تخلیقی اسلوب کی گرفت کہیں بھی ڈھیلی نہیں ہوتی، مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "نثر نگار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اسلوب یعنی سٹائل ہوتی ہے۔ اسلوب، ہیئت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے۔ یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں۔ لفظ ان دونوں کے اشتراکِ باہم کا ذریعہ ہے۔ اس کا درست اور برمحل استعمال خیال میں قوّت پیدا کرتا ہے، اس کی گہرائی میں اضافہ کرتا ہے، معنویت بڑھاتا ہے اور بالآخر اس اسلوب کو جنم دیتا ہے جو ہر تخلیق کار کا اپنا اور یکسر جداگانہ ہوتا ہے اور جس سے اُس کی شخصیت کے بہت سے گوشے آشکار ہوتے ہیں، لفظ دراصل وہ جسم ہے جسے خیال کی روح تحرک اور تازگی بخشتی ہے۔ فن کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غواصی کے عمل سے الفاظ کی مرمریں مورتیوں میں زندگی کی لہر اس طرح دوڑائے کہ ان لفظوں کو اعجازِ گویائی حاصل ہو جائے اور وہ قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگیں جس طرح فن کار تخلیقی لمحے میں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔"
>
> ("فکر و خیال" مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب صفحہ ۲)

اس اقتباس کی اہمیت دو سطحوں پر اُبھرتی ہے ایک علمی اور دوسری عملی!۔ علمی سطح پر انور سدید نے "اسلوب" کی تعریف متعین کی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی ہیئت، خیال اور لفظ کے ربطِ باہم کو کم سے کم الفاظ میں بڑے فن کارانہ انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ بعد میں عملی سطح پر خود اس نے وہی اسلوب اپنایا ہے جو لفظ کی خارجی سطح عبور کر کے اس کے باطن میں چھُپی خوشبو کو پکڑنے پر منتج ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اسلوب فن کار کی ذات ہے۔ ذات سے مراد وہ ذات نہیں جو ظاہر میں نظر آتی ہے۔ ذات تو ایسا پھُول ہے جس کا اپنا رنگ اور الگ سی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ پھُول جہاں نمائش کا متمنی ہوتا ہے وہاں اس کی خوشبو بکھرنے کے لیے ہر دم بے قرار بھی ہوتی ہے، مگر اس پھُول کی نمائش کا وسیلہ کون بنے؟

لفظ، مگر لفظ تو ایسی ہرجائی مخلوق ہے جو ہر کسی کی رعایا بننے پر تیار رہتی ہے۔ ایسے میں لفظ کے اس عمومی مزاج کو کیسے بدلا جائے؟ لفظ کی قلبِ ماہیت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے وہ انوکھی خوشبو عطا کی جائے جو پہلے سے اس کے گرد پھیلی خوشبو پر اس درجہ حاوی ہو جائے کہ اپنی انفرادیت کا اعلان کرتی نظر آئے۔ یوں لفظ بظاہر مانوس مگر بباطن نئی نویلی صورت اختیار کر جائے گا۔ الگ سی بُو باس کا حامل یہی لفظ (پھول) یعنی ذات کے اظہار کا وسیلہ گویا اس کا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب انور سدید کی فنکار ذات کی خوشبو کی صورت میں ابتدا سے اب تک اس کی تحریروں میں جاری و ساری ہے۔ جس طرح شگفتنِ ذات کا عمل کہیں نہیں رُکتا، اسی طرح اسلوب کا سفر بھی ہمیشہ مائل بہ ارتقا رہتا ہے۔ ذات کے جوہر کو اگر حُسن قرار دیا جائے تو اسلوب اس حُسن کا اظہار ٹھہرے گا اور جس طرح حُسن کے تین مدارج حُسنِ پُرتکلف حُسنِ رنگیں اور حُسنِ سادہ ہیں، اسی طرح اسلوب میں بھی تکلف، رنگینی اور سادگی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ انور سدید جب تنقید کے میدان میں آیا تو وہ افسانہ نگاری کے حوالے سے حُسنِ پُرتکلف سے گزر کر حُسنِ رنگیں کی حدود میں داخل ہو چکا تھا، لہٰذا اس کے اسلوب کی ابتدا ہی دوسری منزل یعنی رنگینی سے ہوئی۔ اس ضمن میں ایک اقتباس پہلے آ چکا، اب ایک اور اقتباس دیکھیے:

"ندیم کا افسانہ آغاز سے انجام تک ایک سیدھی سڑک ہے جس کے دونوں کناروں پر اسلوب کی آرائشی جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں اور یہ سڑک ایک خاص نقطۂ نظر کی فوقیت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ ندیم نے اپنی ساری زندگی میں اس موقف سے سرمو انحراف نہیں کیا اور اسے اُجاگر کرنے کیلیے ندیم نے پورے شعور اور گہرے ادراک سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کے افسانوں میں شمال مغربی پنجاب کا جغرافیہ تو پوری صداقت سے طلوع ہوا ہے، لیکن دیہات کی محبت کا چاند گہرے اندھیروں میں ڈوب گیا ہے۔"

("فکر و خیال" اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، صفحہ ۴۸)

اس اقتباس کو اگر پہلے اقتباس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے، تو ایک طرف جملوں کی ترتیب، لفظوں کا صوتی اور معنوی آہنگ اس تخلیقی ذہن کا پتہ دیتے ہیں جو بات کو روایتی انداز میں کہنے کی بجائے غیر رسمی مگر رنگین اور خوشبودار انداز میں پیش کرنے کا جویا ہے تو دوسری طرف جملوں کا فکری نظام اور خیال کا تسلسل اس منفرد سوچ کو بروئے کار لاتے ہیں جو ان کے پیچھے کارفرما ہے۔ اگرچہ یہ اقتباس دو الگ الگ مضامین

سے ہیں، مگر اسلوب کی سطح پر دونوں میں ایک خوش گوار ہم آہنگی اور فکری سطح پر ایک واضح ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں کا موضوع 'اسلوب' ہے مگر جہاں پہلے اقتباس میں انور سدید نے اسلوب کے اجزائے ترکیبی لفظ، ہیئت، خیال سے بحث کر کے اسلوب کا ایک معیار متعین کیا ہے، وہاں دوسرے اقتباس میں ایک افسانہ نگار پر اس معیار کا اطلاق کر کے گویا بین السطور واضح کر دیا ہے کہ آرائشی اور پُر تکلف اسلوب، فطری اور تخلیقی اسلوب سے کیسے مختلف ہوتا ہے۔ جہاں تک انور سدید کے اپنے اسلوب کا تعلق ہے، یہ پہلے جملے سے لے کر آخری جملے تک ندی کی شفاف اور سیال چاندی کی طرح فطری روانی کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔ انور سدید کے نزدیک لفظ وہ جسم ہے جسے خیال کی رَو تحرک اور تازگی بخشتی ہے۔ گویا خیال بہتی ندی ہے جو الفاظ کے مدوّر اور چمکدار جسموں سے ٹکرا کر ان میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے یوں یہ جسم قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگتے ہیں، جس طرح فن کار تخلیقی لمحے میں خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انور سدید نے اپنے اسلوب میں لفظوں کو یہی اعجازِ گویائی بخشا ہے اور خیال کو ندی کا سا بہاؤ عطا کیا ہے۔ اسلوب کا یہ مقام آرائشی اور پُر تکلف اسلوب سے آگے کی منزل میں واقع ہے اور اس منزل کو انور سدید کے اسلوب کی پہلی منزل قرار دے کر اور اس کے ساتھ رنگینی و رعنائی کی صفات وابستہ کر کے میں نے یقیناً کسی مبالغے سے کام نہیں لیا۔

اس گفتگو سے میرے ذہن میں انور سدید کے اسلوب کی ایک اور خوبی بھی اُبھرتی ہے۔ یہ خوبی اس کا وہ لطیف احساسِ موسیقیت ہے جو کم و بیش اس کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے، جس طرح ایک کامیاب شعر کے لیے غنائیت یا موسیقیت اس کی اضافی خوبی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح تخلیقی نثر بھی بہت حد تک اس کی مرہونِ منت ہے اور پھر جب تنقید کی بات ہو تو اس کی ثقالت اور بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے تو موسیقیت کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ یہاں موسیقیت سے میری مراد وہ جوہر ہے جو موسیقی کے باطن میں مُشکِ نافہ کی طرح موجود رہتا ہے۔ انور سدید نے اپنے اسلوب میں مطلوبہ موسیقیت پیدا کرنے کیلئے دو طریق اپنائے ہیں۔ ایک بظاہر آسان دوسرا مشکل۔ آسان طریقہ یوں کہ روایت کی صورت میں انور سدید کے سامنے یہ پہلے سے موجود تھا۔ اس میں الفاظ کے مخصوص معانی ہیں اور ان کا صوتی اور غنائی آہنگ متعین ہے۔ صرف وہ سلیقہ درکار ہے جو ان سب کو بیان و بدیع کی خوبیوں سمیت کام میں لا سکے۔ مثال کے طور پر دو اقتباس دیکھیے کہ انور سدید نے کس سلیقے سے ان میں موسیقیت کا جادو جگایا ہے،

"چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری صرف آرزوؤں اور تمناؤں کی شاعری ہے۔ وہ ندی نالوں کے خروش میں لطافت محسوس کرتے، پہاڑوں کی بلندی انہیں زمین سے بلند ہو کر ستاروں سے ہم کلام ہونے کی دعوت دیتی، بلبلوں کے نغموں اور قمریوں کے زمزموں میں انہیں لحن داؤدی جاگتا ہوا محسوس ہوتا اور شام کے ملگجے دھندلکوں میں انہیں سکونِ ابدی نظر آتا۔ یہ رنگ علامہ اقبال کا مستقل رنگِ اظہار نہیں، بلکہ جوں جوں زندگی کے معنوی اسرار کھلتے گئے۔ تلاش اور جستجو کی لگن بڑھتی گئی اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ہی ایک منظم و مربوط فلسفۂ حیات نمایاں ہوتا گیا۔"

(فکر و خیال 'اُردو ادب کی چند فکری تحریکیں'، ص۲۰)

"عورت کا یہ رومانی پہلو سراسر تخلیقی ہے اور اس میں مشرقی شہزادیوں کا حُسن، پھولوں کی نکہت، کہکشاں کی روشنی اور نسیم سحر کی تازگی سب کا امتزاج فن کار کے حُسن و نظر کے عین مطابق موجود ہوتا ہے۔ فن کار کا جذبہ تمام تر انکسار بن جاتا ہے اور وہ اس کے آگے نہ صرف سجدہ کناں ہو جاتا ہے، بلکہ وفورِ محبت میں اس کے دل سے گیت اور نغمے اُبلنے لگتے ہیں۔ دُنیائے آب و گل سے یہ بے نیازی اور فطرت کے ساتھ بھی والہانہ ہم آغوشی رومانی فن کار کا مقصودِ اوّل ہے اور یہ حاصل ہو جائے، تو اسے مادّی زندگی بھی بے وقعت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس زاویئے سے دیکھئے تو کتنے ہی نوجوان شعراء جذبے کی اس تیز رومانوی آنچ کا سامنا نہ کر سکے اور اپنے دل کی چتا میں جل کر بھسم ہو گئے۔"

(اقبال کے کلاسیکی نقوش 'رومانیت، مخزن اور اقبال' ص۸۴)

مگر غنائیت پیدا کرنے کا یہ آسان طریقہ انور سدید کے اسلوب میں کُل کی محض ایک قاش کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے اسلوب کے جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں، جب موضوع کی ثقاہت اور علمیت کی گرانباری کے باوجود وہ ایسے جملے تخلیق کرتا ہے جو سراسر موسیقیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ یوں علمی زبان میں غنائیت پیدا کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر چند عبارات ملاحظہ کیجیے؛

"اُردو نظم میں صنفِ نازک کا دورِ لطیف اس لحاظ سے بیحد خوش آئند ہے کہ وہ جنسی جذبے جو پہلے صرف صنفِ مخالف کے قلم سے ادا ہوتے تھے، اب صنفِ نازک کے کومل لبوں سے بھی ادا ہونے لگے ہیں۔ یوں مشرق کی چھوئی موئی عورت نے پہلی دفعہ اظہارِ جذبات

کی آزادی کا مظاہرہ کیا، تو صاف نظر آنے لگا کہ جوار بھاٹا تو پوری شدت سے زیرِ سطح متلاطم تھا، لیکن اس پر بند باندھنے کی جو کوشش کی جا رہی تھی، وہ مصنوعی اور غیر فطری تھی۔"
(اختلافات 'اُردو نظم میں صنفِ نازک کے جنسی رجحانات ص ۲۲)

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انگلستان اور جرمنی میں جب انہوں نے مسلمانوں کے فلسفے کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ یورپی مفکرین کی راہنمائی میں کیا، تو ان پر ایک نیا جہانِ معنی آشکار ہوا۔ اس زمانے میں وہ جن نابغانِ فکر سے متاثر ہوئے، ان میں مولانا جلال الدین رومی اور نطشے بالخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں میں قدرِ مشترک، فکر، حرکت اور عمل کا مثبت زاویہ ہے جو اپنی ذات میں انسان کے یقین کو مستحکم کرتا ہے اور عالمِ انفس و آفاق کی تسخیر کے لیے رقصِ جاں کو ضرورتِ اولیٰ قرار دیتا ہے۔ (اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال کی تحریک ص ۴۲)

ایسی عبارات سے انور سدید کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ میں تو جب ان جملوں کو پڑھتا ہوں تو لاشعوری طور پر میرا ذہن ایک ایسے موسیقار کو میرے سامنے لا بٹھاتا ہے جو تھاپ کی سنگت میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ تھاپ کی خوبی ہے کہ وہ نہ صرف آواز کی سنگت کرتی ہے، بلکہ اس کے زیر و بم کو بھی گھٹانے اُبھارنے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ پھر جہاں آواز کو اس کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں یہ ایک وفادار کی طرح چُپ سادھ لیتی ہے۔ پھر جو اچانک بولتی ہے، تو محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس تھاپ نے آواز کا ساتھ نہ دیا ہوتا، تو مُطلوبہ سحر ابھارنے میں ناکام رہتا۔ یہی طریقۂ کار انور سدید کے اسلوب میں موسیقیت پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ جملوں کی روانی میں جہاں کہیں لَے ٹوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے، وہاں خط کشیدہ خوبصورت تراکیب اور مرکبات طبلے کی تھاپ بن کر اس کو ٹوٹنے سے بچا لیتے ہیں۔

اب آخر میں پلٹ کر جب مضمون پر نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ کہنے کے باوجود ابھی انور سدید کے فکر و فن کے کئی اہم گوشے باقی رہ گئے ہیں جو روشنی میں نہیں لائے جا سکے، مثلاً اس کے تنقیدی موضوعات میں سے ان عصری ادبی مسائل اور مباحث کا ذکر نہیں ہو پایا، جن سے اس کی اوریجنل سوچ اور وسیع مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ انور سدید کے اسلوب کے اس نادر پہلو کا بھی ذکر نہیں ہوا جو ایک طرف بے باکی، دقتِ نظر اور حق گوئی کی صفات سے عبارت ہے اور دوسری طرف بقول غلام الثقلین نقوی تلخی، ترشی اور شیرینی کے امتزاج سے ایک نئے تنقیدی فلیور کا احساس دلاتا ہے۔ ظاہر ہے اس سب کے لیے جو وقت درکار تھا وہ مجھے میسر نہ آسکا، لہٰذا یار زندہ صحبت باقی کا سہارا لے کر رخصت کی اجازت چاہوں گا۔

سجاد نقوی

اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش

"اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" ڈاکٹر انور سدید کی نئی تنقیدی کتاب ہے۔ انور سدید ہمارے ان نقادوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اُن کے ادبی مخالفین بھی ہمیشہ اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ

> "انہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں سے ہمیشہ بحث و نظر کے در وا کیے ہیں۔ اپنے نام کی مناسبت سے انور سدید "قولِ سدید" کے قائل ہیں۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر دو ٹوک الفاظ اور غیر مفاہمتی انداز میں بات کرنے کے خوگر ہیں۔"

ان کی تنقید کی کتابوں میں سے "فکر و خیال" "اختلافات" اور "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کی پذیرائی ادبی دنیا میں خاطر خواہ ہوئی لیکن اب جو کتاب ہمارے سامنے ہے وہ موضوع کے اعتبار سے ہی انوکھی نہیں بلکہ جس وسعتِ مطالعہ سے انور سدید نے موضوع پر تنقیدی عمل آزمایا ہے وہ بھی منفرد ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات بڑی اہم ہے کہ دیہات اُردو افسانے کا محبوب و مرغوب موضوع نہیں۔ حالانکہ برصغیر کی پچھتر فیصد آبادی دیہاتوں میں ہی آباد ہے۔ اُردو کے معروف افسانہ نگاروں نے پچیس فی صد شہری آبادی کے احساسات و مسائل کو تو سنجیدگی اور فنکاری سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن دیہات جہاں اَن گنت اور جنل افسانے بکھرے پڑے ہیں اور جہاں فطرت کی ہر کروٹ ایک نئے افسانے کو جنم دے ڈالتی ہے تا حال معدودے چند افسانہ نگاروں کی فنی اور تخلیقی توجہ حاصل کر سکا ہے۔ انور سدید نے منشی پریم چند سے لے کر زمانۂ حال کے افسانہ نگار

مرزا حامد بیگ تک کے فن سے زرعی معاشرے کے افسانوں کو الگ کر کے دیہات نگاری کے منفرد زاویوں کو تلاش کیا اور پھر مختلف افسانہ نگاروں کی دیہات نگاری کی انفرادیت دریافت کرلی۔ اس لحاظ سے انور سدید نے اُردو افسانے کا مطالعہ ایک اچھوتے زاویے سے کیا ہے اور ہمیں اس حقیقت سے آگہی بخشی ہے کہ دیہات کے بارے میں مختلف افسانہ نگاروں کا رویّہ کیا ہے اور اُنہوں نے اُردو افسانے میں دیہات کے کس رُوپ کو پیش کیا ہے۔

انور سدید نے "حرفِ اوّل" میں سوال اٹھایا ہے کہ "جب صادق قدروں اور انسانی جذبات میں امتیاز کرنا ممکن نہیں تو دیہات اور شہر کی پیشکش میں بالخصوص دیہات کو مرکزِ توجہ کیوں بنایا گیا ہے؟" انور سدید نے لکھا ہے کہ "دیہات کی تہذیب شہر کے تمدن سے خاصی مختلف ہے۔ دیہات زمین کے ساتھ چمٹا ہوا ہے لیکن اس کی نظر آسمان کی طرف رہتی ہے۔ برکھا وقت پر ہو تو زمین سیراب ہو جاتی ہے اور فصل کے پکنے کی اُمید تازہ ہو جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر کسان بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دیہات کی اس نوعیت نے اس کے بنیادی مزاج کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس فضا میں جو کردار جنم لیتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں وہ سماجی اور نفسیاتی مطالعے کا یکسر الگ مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان کی مزاجی کیفیات منفرد نوعیت کی اور ان کی شخصیت کی نمو کے پہلو مختلف ہیں۔"

یہ توضیح کتاب "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" کی وجہ تالیف بھی ہے اور اسی کو اپنا موضوع بنا کر انور سدید نے اُردو افسانے میں پیش کیے گئے دیہات کے کثیر الاضلاع زاویوں کو تلاش کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ انور سدید افسانے میں دیہات کی پیش کش کا تجزیہ کرنے پر اچانک آمادہ نہیں ہوئے بلکہ اس کتاب کے پس پشت دیہات سے ان کی گہری وابستگی کی ایک داستان بھی موجود ہے۔ راغب شکیب نے اس کتاب کے حرفِ آخر میں لکھا ہے کہ "ان کو ابتدائے حیات میں ہی دیہات اور دیہات نما شہروں میں رہنے کا موقعہ ملا۔ فرائضِ منصبی کے سلسلے میں بھی وہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں پھرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے زمین اور اُس کی تخلیقی قوت کا، دیہات اور اُس کے مزاج کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہ تخلیق نگاری کی طرف آئے تو دیہات نگاری کو ہی اظہار کا اوّلین وسیلہ بنایا۔" راغب شکیب نے انور سدید کے

چند ایسے افسانے مثلاً "مجبوری"، "ریشمی دوپٹہ"، "باپ"، "گوراں"، "مایوس آنکھیں" اور "سو روپے" کی نشاندہی بھی کی ہے جو اُسی دور کے مقبول رسائل میں شائع ہوئے تھے لیکن اب دستیاب نہیں۔ ان کا افسانہ "کچی مٹی کا بند" رسالہ "اوراق" میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ انور سدید نے اس افسانے میں پکھو ندی میں آئے ہوئے طوفان اور دیہات کی دوشیزہ فلکو کے داخل میں جوانی کے اُٹھتے ہوئے طغیان میں مماثلت تلاش کی تھی اور ان دونوں کو بند توڑنے اور آسودگی کی راہ تلاش کرنے میں مدد دی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی "شامِ دوستاں آباد" میں جب ایک دفعہ دیہاتی افسانے کے موضوع پر بحث چھڑی تو یہ اتنی خیال انگیز ثابت ہوئی کہ انور سدید اس موضوع پر مقالہ لکھنے پر تیار ہو گئے۔ اس مقالے کو ڈاکٹر وزیر آغا نے "اوراق" کی اشاعتِ خاص میں نمایاں طور پر شائع کیا تو علمی و ادبی حلقوں میں ایک غلغلہ بپا ہو گیا اور اس کی بازگشت بھارت کے ادبی حلقوں میں بھی سُنی گئی۔ انور سدید نے اس کتاب کے "حرفِ اوّل" میں لکھا ہے کہ

"متعدد دوستوں نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا تقاضا کیا۔ اس تقاضے میں سب سے زیادہ شدت جناب ساحل احمد نے پیدا کی، ان کا مسلسل اصرار اگر دم توڑ دیتا تو شاید یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچتی۔"

دوسرے لفظوں میں انور سدید کے ایک مقالے نے جب مزید وسعت اختیار کی تو زیرِ نظر کتاب معرضِ وجود میں آئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کتاب متذکرہ مقالے کی توسیع نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا نیا مواد استعمال کیا گیا ہے۔ مقالے میں صرف چھ افسانہ نگاروں پریم چند، احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی، صادق حسین، بلونت سنگھ اور جمیلہ ہاشمی کے فن اور ان کی دیہات نگاری کے انفرادی گوشے دریافت کیے گئے تھے لیکن اس کتاب میں کم و بیش پچاس افسانہ نگاروں کی دیہات نگاری کے زاویے تلاش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے ایک محترم نقاد نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کی وسعت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ انہوں نے صرف افسانوی مجموعوں کو ہی پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ بے شمار ایسے افسانوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جو رسالوں کے انبار میں دفن ہیں۔"

اس کے باوصف انور سدید کا انکسار یہ ہے کہ وہ بعض افسانوں اور افسانہ نگاروں تک

تخلیقی اسلوب کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اسلوب اکتسابی نہیں، وہبی ہے اور تنقید کے میدان میں آنے سے بہت پہلے انور سدید کا افسانہ نگاری کے سفر میں فنی پختگی کے بہت سے مراحل طے کر چکا تھا۔ اسی لیے تو جب ہم انور سدید کے اولین مضمون "مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب" کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مضمون کے آغاز سے انجام تک اس کے تخلیقی اسلوب کی گرفت کہیں بھی ڈھیلی نہیں ہوتی، مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو،

"نثر نگار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اسلوب یعنی سٹائل ہوتی ہے۔ اسلوب، ہیئت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے۔ یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں۔ لفظ ان دونوں کے اشتراکِ باہم کا ذریعہ ہے۔ اس کا درست اور برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے، اس کی گہرائی میں اضافہ کرتا ہے، معنویت بڑھاتا ہے اور بالآخر اس اسلوب کو جنم دیتا ہے جو ہر تخلیق کار کا اپنا اور یکسر جداگانہ ہوتا ہے اور جس سے اُس کی شخصیت کے بہت سے گوشے آشکار ہوتے ہیں، لفظ دراصل وہ جسم ہے جسے خیال کی روح تحرک اور تازگی بخشتی ہے۔ فن کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غواصی کے عمل سے الفاظ کی مرمریں مورتیوں میں زندگی کی لہر اس طرح دوڑائے کہ ان لفظوں کو اعجازِ گویائی حاصل ہو جائے اور وہ قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگیں جس طرح فن کار تخلیقی لمحے میں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔"

("فکر و خیال" مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب ص ۲۰)

اس اقتباس کی اہمیت دو سطحوں پر اُبھرتی ہے ایک علمی اور دوسری عملی! علمی سطح پر انور سدید نے "اسلوب" کی تعریف متعین کی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی ہیئت، خیال اور لفظ کے ربطِ باہم کو کم سے کم الفاظ میں بڑے فن کارانہ انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ بعد میں عملی سطح پر خود اس نے وہی اسلوب اپنایا ہے جو لفظ کی خارجی سطح عبور کر کے اس کے باطن میں چھپی خوشبو کو پکڑنے پر منتج ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اسلوب فن کار کی ذات ہے۔ ذات سے مراد وہ ذات نہیں جو ظاہر میں نظر آتی ہے۔ ذات تو ایسا پھول ہے جس کا اپنا رنگ اور الگ سی خوشبو ہوتی ہے۔ یہ پھول جہاں نمائش کا متمنی ہوتا ہے، وہاں اس کی خوشبو بکھرنے کے لیے ہر دم بے قرار بھی ہوتی ہے، مگر اس پھول کی نمائش کا وسیلہ کون بنے؟

لفظ، مگر لفظ تو ایسی ہرجائی مخلوق ہے جو ہر کسی کی رعایا بننے پر تیار رہتی ہے۔ ایسے میں لفظ کے اس عمومی مزاج کو کیسے بدلا جائے؟ لفظ کی قلبِ ماہیت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے وہ انوکھی خوشبو عطا کی جائے جو پہلے سے اس کے گرد پھیلی خوشبو پر اس درجہ حاوی ہو جائے کہ اپنی انفرادیت کا اعلان کرتی نظر آئے۔ یوں لفظ بظاہر مانوس مگر بباطن نئی نویلی صورت اختیار کر جائے گا۔ الگ سی بُو باس کا حامل یہی لفظ (پھول) یعنی ذات کے اظہار کا وسیلہ گویا اس کا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب انور سدید کی فنکار ذات کی خوشبو کی صورت میں ابتدا سے اب تک اس کی تحریروں میں جاری و ساری ہے۔ جس طرح شگفتنِ ذات کا عمل کہیں نہیں رُکتا، اسی طرح اسلوب کا سفر بھی ہمیشہ مائل بہ ارتقاء رہتا ہے۔ ذات کے جوہر کو اگر حُسن قرار دیا جائے تو اسلوب اس حُسن کا اظہار ٹھہرے گا اور جس طرح حُسن کے تین مدارج حسنِ پُر تکلف حُسنِ رنگیں اور حُسنِ سادہ ہیں، اسی طرح اسلوب میں بھی تکلف، رنگینی اور سادگی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ انور سدید جب تنقید کے میدان میں آیا تو وہ افسانہ نگاری کے حوالے سے حُسنِ پُر تکلف سے گزر کر حُسنِ رنگیں کی حدود میں داخل ہو چکا تھا، لہٰذا اس کے اسلوب کی ابتدا ہی دوسری منزل یعنی رنگینی سے ہوئی۔ اس ضمن میں ایک اقتباس پہلے آ چکا، اب ایک اور اقتباس دیکھیے:

"ندیم کا افسانہ آغاز سے انجام تک ایک سیدھی سڑک ہے جس کے دونوں کناروں پر اسلوب کی آرائشی جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں اور یہ سڑک ایک خاص نقطۂ نظر کی فوقیت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ ندیم نے اپنی ساری زندگی میں اس موقف سے سرِ مو انحراف نہیں کیا اور اسے اُجاگر کرنے کیلیے ندیم نے پورے شعور اور گہرے ادراک سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کے افسانوں میں شمال مغرب پنجاب کا جغرافیہ تو پوری صداقت سے طلوع ہوا ہے، لیکن دیہات کی محبت کا چاند گہرے اندھیروں میں ڈوب گیا ہے۔"

("فکر و خیال" اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، صفحہ ۴۸)

اس اقتباس کو اگر پہلے اقتباس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے، تو ایک طرف جملوں کی ترتیب، لفظوں کا صوتی اور معنوی آہنگ اس تخلیقی ذہن کا پتہ دیتے ہیں جو بات کو روایتی انداز میں کہنے کی بجائے غیر رسمی مگر رنگین اور خوشبو دار انداز میں پیش کرنے کا جویا ہے تو دوسری طرف جملوں کا فکری نظام اور خیال کا تسلسل اس منفرد سوچ کو بروئے کار لاتے ہیں جو ان کے پیچھے کارفرما ہے۔ اگرچہ یہ اقتباس دو الگ الگ مضامین

سے ہیں، مگر اسلوب کی سطح پر دونوں میں ایک خوش گوار ہم آہنگی اور فکری سطح پر ایک واضح ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔ دونوں کا موضوع "اسلوب" ہے مگر جہاں پہلے اقتباس میں انور سدید نے اسلوب کے اجزائے ترکیبی لفظ، ہیئت، خیال سے بحث کرکے اسلوب کا ایک معیار متعین کیا ہے، وہاں دوسرے اقتباس میں ایک افسانہ نگار پر اس معیار کا اطلاق کرکے گویا بین السطور واضح کر دیا ہے کہ آرائشی اور پر تکلف اسلوب، فطری اور تخلیقی اسلوب سے کیسے مختلف ہوتا ہے۔ جہاں تک انور سدید کے اپنے اسلوب کا تعلق ہے، یہ پہلے جملے سے لے کر آخری جملے تک ندی کی شفاف اور سیال چاندی کی طرح فطری روانی کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔ انور سدید کے نزدیک لفظ وہ جسم ہے جسے خیال کی رَو تحرک اور تازگی بخشتی ہے۔ گویا خیال بہتی ندی ہے جو الفاظ کے مدوّر اور چمکدار جسموں سے ٹکرا کر ان میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے یوں یہ جسم قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگتے ہیں، جس طرح فن کار تخلیقی لمحے میں خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انور سدید نے اپنے اسلوب میں لفظوں کو بھی اعجازِ گویائی بخشا ہے اور خیال کو ندی کا سا بہاؤ عطا کیا ہے۔ اسلوب کا یہ مقام آرائشی اور پر تکلف اسلوب سے آگے کی منزل میں واقع ہے اور اس منزل کو انور سدید کے اسلوب کی پہلی منزل قرار دے کر اور اس کے ساتھ رنگینی و رعنائی کی صفات وابستہ کرکے میں نے یقیناً کسی مبالغے سے کام نہیں لیا۔

اس گفتگو سے میرے ذہن میں انور سدید کے اسلوب کی ایک اور خوبی بھی ابھرتی ہے۔ یہ خوبی اس کا وہ لطیف احساسِ موسیقیت ہے جو کم و بیش اس کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود رہتا ہے، جس طرح ایک کامیاب شعر کے لیے غنائیت یا موسیقیت اس کی اضافی خوبی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح تخلیقی نثر بھی بہت حد تک اس کی مرہونِ منت ہے اور پھر جب تنقید کی بات ہو تو اس کی ثقالت اور بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے تو موسیقیت کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ یہاں موسیقیت سے میری مراد وہ جوہر ہے جو موسیقی کے باطن میں مشک نافہ کی طرح موجود رہتا ہے۔ انور سدید نے اپنے اسلوب میں مطلوبہ موسیقیت پیدا کرنے کیلئے دو طریق اپنائے ہیں۔ ایک بظاہر آسان دوسرا مشکل۔ آسان طریقہ یوں کہ روایت کی صورت میں انور سدید کے سامنے یہ پہلے سے موجود تھا۔ اس میں الفاظ کے مخصوص معانی ہیں اور ان کا صوتی اور غنائی آہنگ متعین ہے۔ صرف وہ سلیقہ درکار ہے جو ان سب کو بیان و بدیع کی خوبیوں سمیت کام میں لا سکے۔ مثال کے طور پر دو اقتباس دیکھیے کہ انور سدید نے کس سلیقے سے ان میں موسیقیت کا جادو جگایا ہے،

"چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری صرف آرزوؤں اور تمناؤں کی شاعری ہے۔ وہ ندی نالوں کے خروش میں لطافت محسوس کرتے، پہاڑوں کی بلندی انہیں زمین سے بلند ہو کر ستاروں سے ہم کلام ہونے کی دعوت دیتی، بلبلوں کے نغموں اور قمریوں کے زمزموں میں انہیں لحن داؤدی جاگتا ہوا محسوس ہوتا اور شام کے ملگجے دھندلکوں میں انہیں سکونِ ابدی نظر آتا۔ یہ رنگ علامہ اقبال کا مستقل رنگِ اظہار نہیں، بلکہ جوں جوں زندگی کے معنوی اسرار کھلتے گئے، تلاش اور جستجو کی لگن بڑھتی گئی اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ہی ایک منظم و مربوط فلسفۂ حیات نمایاں ہوتا گیا۔"

(فکر و خیال "اردو ادب کی چند فکری تحریکیں، ص۲۰)

"عورت کا یہ رومانی پہلو سراسر تخلیقی ہے اور اس میں مشرقی شہزادیوں کا حسن، پھولوں کی نکہت، کہکشاں کی روشنی اور نسیم سحر کی تازگی سب کا امتزاج فن کار کے حسن و نظر کے عین مطابق موجود ہوتا ہے۔ فن کار کا جذبہ تمام تر انکسار بن جاتا ہے اور وہ اس کے آگے نہ صرف سجدہ کناں ہو جاتا ہے، بلکہ دفورِ محبت میں اس کے دل سے گیت اور نغمے ابلنے لگتے ہیں۔ دنیائے آب و گل سے یہ بے نیازی اور فطرت کے ساتھ بھی والہانہ ہم آغوشی رومانی فن کار کا مقصودِ اول ہے اور یہ حاصل ہو جائے تو اسے مادی زندگی بھی بے وقعت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو کتنے ہی نوجوان شعراء جذبے کی اس تیز رومانوی آنچ کا سامنا نہ کر سکے اور اپنے دل کی چتا میں جل کر بھسم ہو گئے۔"

(اقبال کے کلاسیکی نقوش، رومانیت، مخزن اور اقبال ص۸۴)

مگر غنائیت پیدا کرنے کا یہ آسان طریقہ انور سدید کے اسلوب میں کل کی محض ایک قاش کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے اسلوب کے جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں، جب موضوع کی ثقاہت اور علمیت کی گرانباری کے باوجود وہ ایسے جملے تخلیق کرتا ہے جو سراسر موسیقیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ یوں علمی زبان میں غنائیت پیدا کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔ مثال کے طور پر چند عبارات ملاحظہ کیجیے:

"اردو نظم میں صنفِ نازک کا دورِ لطیف اس لحاظ سے بے حد خوش آئند ہے کہ وہ جنسی جذبے جو پہلے صرف صنفِ مخالف کے قلم سے ادا ہوتے تھے، اب صنفِ نازک کے کومل لبوں سے بھی ادا ہونے لگے ہیں۔ یوں مشرق کی چھوئی موئی عورت نے پہلی دفعہ اظہارِ جذبات

کی آزادی کا مظاہرہ کیا، تو صاف نظر آنے لگا کہ جوار بھاٹا تو پوری شدت سے زیرِ سطح متلاطم تھا، لیکن اس پر بند باندھنے کی جو کوشش کی جا رہی تھی، وہ مصنوعی اور غیر فطری تھی۔"
(اختلافات 'اردو نظم میں صنفِ نازک کے جنسی رجحانات صـ۲۳)

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انگلستان اور جرمنی میں جب انہوں نے مسلمانوں کے فلسفے کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ یورپی متفکرین کی راہنمائی میں کیا، تو ان پر ایک نیا جہانِ معنی آشکار ہوا۔ اس زمانے میں وہ جن نابغانِ فکر سے متاثر ہوئے، ان میں مولانا جلال الدین رومی اور نطشے بالخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں میں قدرِ مشترک، فکر، حرکت اور عمل کا مثبت زاویہ ہے جو اپنی ذات میں انسان کے یقین کو مستحکم کرتا ہے اور عالمِ انفس و آفاق کی تسخیر کے لیے رقصِ جاں کو ضرورتِ اولیٰ قرار دیتا ہے۔" (اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال کی تحریک صـ۲۴)

ایسی عبارات سے انور سدید کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ میں تو جب ان جملوں کو پڑھتا ہوں تو لاشعوری طور پر میرا ذہن ایک ایسے موسیقار کو میرے سامنے لا بٹھاتا ہے جو تھاپ کی سنگت میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ تھاپ کی خوبی ہے کہ وہ نہ صرف آواز کی سنگت کرتی ہے، بلکہ اس کے زیر و بم کو بھی گھٹانے ابھارنے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ پھر جہاں آواز کو اس کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں یہ ایک وفادار کی طرح چپ سادھ لیتی ہے۔ پھر جو اچانک بولتی ہے، تو محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس تھاپ نے آواز کا ساتھ نہ دیا ہوتا، تو سُرِ مطلوبہ سحر ابھارنے میں ناکام رہتا۔ یہی طریقہ کار انور سدید کے اسلوب میں موسیقیت پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ جملوں کی روانی میں جہاں کہیں لے ٹوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے، وہاں خطِ کشیدہ خوبصورت تراکیب اور مرکبات طبلے کی تھاپ بن کر اس کو ٹوٹنے سے بچا لیتے ہیں۔

اب آخر میں پلٹ کر جب مضمون پر نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ کہنے کے باوجود ابھی انور سدید کے فکر و فن کے کئی اہم گوشے باقی رہ گئے ہیں جو روشنی میں نہیں لائے جا سکے، مثلاً اس کے تنقیدی موضوعات میں سے ان عصری ادبی مسائل اور مباحث کا ذکر نہیں ہو پایا، جن سے اس کی اوریجنل سوچ اور وسیع مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ انور سدید کے اسلوب کے اس نادر پہلو کا بھی ذکر نہیں ہوا جو ایک طرف بے باکی، دقتِ نظر اور حق گوئی کی صفات سے عبارت ہے اور دوسری طرف بقول غلام الثقلین نقوی تلخی، ترشی اور شیرینی کے امتزاج سے ایک نئے تنقیدی فلیور کا احساس دلاتا ہے۔ ظاہر ہے اس سب کے لیے جو وقت درکار تھا، وہ مجھے میسر نہ آسکا، لہٰذا 'یار زندہ صحبت باقی' کا سہارا لے کر رخصت کی اجازت چاہوں گا۔

سجاد نقوی

اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش

"اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" ڈاکٹر انور سدید کی نئی تنقیدی کتاب ہے۔ انور سدید ہمارے ان نقادوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اُن کے ادبی مخالفین بھی ہمیشہ اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ

"انہوں نے اپنی تنقیدی تحریروں سے ہمیشہ بحث و نظر کے دَر وَا کیے ہیں۔ اپنے نام کی مناسبت سے انور سدید "قولِ سدید" کے قائل ہیں۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر دو ٹوک الفاظ اور غیر مفاہمتی انداز میں بات کرنے کے خوگر ہیں۔"

ان کی تنقید کی کتابوں میں سے "فکر و خیال" "اختلافات" اور "اقبال کے کلاسیکی نقوش" کی پذیرائی ادبی دنیا میں خاطر خواہ ہوئی لیکن اب جو کتاب ہمارے سامنے ہے وہ موضوع کے اعتبار سے ہی انوکھی نہیں بلکہ جس وسعتِ مطالعہ سے انور سدید نے موضوع پر تنقیدی عمل آزمایا ہے وہ بھی منفرد ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات بڑی اہم ہے کہ دیہات اُردو افسانے کا محبوب و مرغوب موضوع نہیں۔ حالانکہ برِصغیر کی پچھتّر فیصد آبادی دیہاتوں میں ہی آباد ہے۔ اُردو کے معروف افسانہ نگاروں نے پچیس فی صد شہری آبادی کے احساسات و مسائل کو تو سنجیدگی اور فنکاری سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے لیکن دیہات جہاں اَن گنت اور جنگل افسانے بکھرے پڑے ہیں اور جہاں فطرت کی ہر کروٹ ایک نئے افسانے کو جنم دے ڈالتی ہے تا حال معدودے چند افسانہ نگاروں کی فنی اور تخلیقی توجہ حاصل کر سکا ہے۔ انور سدید نے منشی پریم چند سے لے کر زمانۂ حال کے افسانہ نگار

مرزا حامد بیگ تک کے فن سے زرعی معاشرے کے افسانوں کو الگ کر کے دیہات نگاری کے منفرد زاویوں کو تلاش کیا اور پھر مختلف افسانہ نگاروں کی دیہات نگاری کی انفرادیت دریافت کر لی۔ اس لحاظ سے انور سدید نے اُردو افسانے کا مطالعہ ایک اچھوتے زاویے سے کیا ہے اور ہمیں اس حقیقت سے آگہی بخشی ہے کہ دیہات کے بارے میں مختلف افسانہ نگاروں کا رویّہ کیا ہے اور اُنہوں نے اُردو افسانے میں دیہات کے کس رُوپ کو پیش کیا ہے۔

انور سدید نے "حرفِ اوّل" میں سوال اٹھایا ہے کہ "جب صادق قدروں اور انسانی جذبات میں امتیاز کرنا ممکن نہیں تو دیہات اور شہر کی پیشکش میں بالخصوص دیہات کو مرکزِ توجہ کیوں بنایا گیا ہے؟" انور سدید نے لکھا ہے کہ "دیہات کی تہذیب شہر کے تمدن سے خاصی مختلف ہے۔ دیہات زمین کے ساتھ چمٹا ہوا ہے لیکن اس کی نظر آسمان کی طرف رہتی ہے۔ برکھا رُت پر ہو تو زمین سیراب ہو جاتی ہے اور فصل کے پکنے کی اُمید تازہ ہو جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر کسان بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ دیہات کی اس نوعیت نے اس کے بنیادی مزاج کو ایک مخصوص ڈھانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس فضا میں جو کردار جنم لیتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں وہ سماجی اور نفسیاتی مطالعے کا یکسر الگ مواد فراہم کرتے ہیں، ان کی مزاجی کیفیات منفرد نوعیت کی اور ان کی شخصیت کی نمود کے پہلو مختلف ہیں۔"

یہ توضیح کتاب "اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" کی وجہ تالیف بھی ہے اور اسی کو اپنا موضوع بنا کر انور سدید نے اُردو افسانے میں پیش کیے گئے دیہات کے کثیر الاضلاع زاویوں کو تلاش کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ انور سدید افسانے میں دیہات کی پیش کش کا تجزیہ کرنے پر اچانک آمادہ نہیں ہوئے بلکہ اس کتاب کے پس پشت دیہات سے ان کی گہری وابستگی کی ایک داستان بھی موجود ہے۔ راغب شکیب نے اس کتاب کے حرفِ آخر میں لکھا ہے کہ "ان کو ابتدائے حیات میں ہی دیہات اور دیہات نما شہروں میں رہنے کا موقعہ ملا۔ فرائضِ منصبی کے سلسلے میں بھی وہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں پھرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے زمین اور اُس کی تخلیقی قوت کا، دیہات اور اس کے مزاج کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہ تخلیق نگاری کی طرف آئے تو دیہات نگاری کو ہی اظہار کا اوّلین وسیلہ بنایا۔" راغب شکیب نے انور سدید کے

چند ایسے افسانے مثلاً "مجبوری"، "ریشمی دوپٹہ"، "باپ"، "گوراں"، "مایوس آنکھیں" اور "سو روپے" کی نشاندہی بھی کی ہے جو اُسی دور کے مقبول رسائل میں شائع ہوئے تھے لیکن اب دستیاب نہیں۔ ان کا افسانہ "کچی مٹی کا بند" رسالہ "اوراق" میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ انور سدید نے اس افسانے میں ملکھو ندی میں آئے ہوئے طوفان اور دیہات کی دوشیزہ فلکو کے داخل میں جوانی کے اُٹھتے ہوئے طغیان میں مماثلت تلاش کی تھی اور ان دونوں کو بند توڑنے اور آسودگی کی راہ تلاش کرنے میں مدد دی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام دوستاں آباد" میں جب ایک دفعہ دیہاتی افسانے کے موضوع پر بحث چھڑی تو یہ اتنی خیال انگیز ثابت ہوئی کہ انور سدید اس موضوع پر مقالہ لکھنے پر تیار ہو گئے۔ اس مقالے کو ڈاکٹر وزیر آغا نے "اوراق" کی اشاعتِ خاص میں نمایاں طور پر شائع کیا تو علمی و ادبی حلقوں میں ایک غلغلہ بپا ہو گیا اور اس کی بازگشت بھارت کے ادبی حلقوں میں بھی سُنی گئی۔ انور سدید نے اس کتاب کے "حرفِ اوّل" میں لکھا ہے کہ

"متعدد دوستوں نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا تقاضا کیا۔ اس تقاضے میں سب سے زیادہ شدت جناب ساحل احمد نے پیدا کی، ان کا مسلسل اصرار اگر دم توڑ دیتا تو شاید یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچتی۔"

دوسرے لفظوں میں انور سدید کے ایک مقالے نے جب مزید وسعت اختیار کی تو زیرِ نظر کتاب معرضِ وجود میں آئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کتاب متذکرہ مقالے کی توسیع نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا نیا مواد استعمال کیا گیا ہے۔ مقالے میں صرف چھ افسانہ نگاروں پریم چند، احمد ندیم قاسمی، غلام الثقلین نقوی، صادق حسین، بلونت سنگھ اور جمیلہ ہاشمی کے فن اور ان کی دیہات نگاری کے انفرادی گوشے دریافت کئے گئے تھے لیکن اس کتاب میں کم و بیش پچاس افسانہ نگاروں کی دیہات نگاری کے زاویے تلاش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے ایک محترم نقاد نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کی وسعت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ انہوں نے صرف افسانوی مجموعوں کو ہی پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ بے شمار ایسے افسانوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جو رسالوں کے انبار میں دفن ہیں۔"

اس کے باوصف انور سدید کا انکسار یہ ہے کہ وہ بعض افسانوں اور افسانہ نگاروں تک

عدم رسائی کا اعتراف کرتے ہیں، انہوں نے اس کتاب کو "حرفِ آخر" شمار نہیں کیا اور وہ اس میں ترمیم و اضافہ کے لیے مزید مطالعے اور نئی معلومات کی تلاش میں بھی سرگرداں ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے منشی پریم چند کو دیہاتی افسانے کا پیش رو قرار دیا ہے۔ انہوں نے پریم چند کے افسانوں میں سے "راہِ نجات"، "پنچایت"، "بدنصیب ماں"، "روشنی" اور "بے غرض محسن" کے اقتباسات سے پریم چند کی انسان دوستی کو اجاگر کیا اور ان قدروں کی نشاندہی کی ہے جن کی افزائش دیہاتی معاشرے میں ہو رہی تھی۔ اردو افسانے میں پریم چند کی تقلید خاصے بڑے پیمانے پر ہوئی۔ انور سدید نے پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، اختر اورینوی اور پریم ناتھ در وغیرہ کو دیہات نگاری میں پریم چند کے روشن نقوش قبول کرنے والے افسانہ نگار شمار کیا ہے اور ان مماثلتوں کی نشاندہی کی ہے جو پریم چند اور ان کی تقلید کرنے والوں میں موجود تھیں۔ دیہات نگاری کو رومانی نظر اور اشتراکی نقطۂ نظر سے پیش کرنے والوں میں سرِفہرست کرشن چندر کا نام آتا ہے۔ انور سدید کا تجزیہ ہے کہ کشمیر میں غربت اور امارت کی جو آویزش سرگرم عمل تھی اسے کرشن چندر نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے نمایاں کیا اور یوں کشمیر کے دیہات کی مؤثر تصویریں کھینچ دیں۔ احمد ندیم قاسمی اردو افسانے میں دیہات نگاری کا ایک اہم نام ہے لیکن انور سدید نے احمد ندیم قاسمی کے نفسیاتی تجزیے سے جن دو باتوں کا استخراج کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دیہات سے شہر کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں تو شہر ان کے لیے آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں دیہات ایک منفعل کردار ہے۔

"احمد ندیم قاسمی نے دیہات کی پیش کش میں بالعموم کرشن چندر کی تقلید کی ہے۔ کرشن چندر نے جو تصویریں کشمیر میں اُتاری تھیں احمد ندیم قاسمی نے ان کے نئے پرنٹ وادیٔ سون کے دیہات میں اُتارے اور قریباً یکساں قسم کا تاثر پیدا کیا۔"

انور سدید نے اس دعوے کے ثبوت میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں سے اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے یہ چونکا دینے والا تجزیہ ہمیں کچھ غلط نظر نہیں آتا۔ دیہات نگاری کے سلسلے میں ہی انور سدید نے پریم ناتھ پردیسی، راما نند ساگر اور شمس آغا کو بھی کرشن چندر کے مقلدین میں ہی شمار کیا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کرشن چندر کی وفات کے بعد اس کی مقبولیت کا گراف نیچے چلا جا رہا

ہے۔ انور سدید نے اس کی انفرادیت کا ایک روشن نقش دریافت کر کے کرشن چندر کو بہترین خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

دیہات کی پیش کش کے انفرادی زاویوں میں سے انور سدید نے بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی غلام الثقلین نقوی اور صادق حسین کو اہمیت دی ہے چنانچہ بلونت سنگھ دیہات کے حیوانی جذبوں اور غیر تربیت یافتہ قوت کا مظہر ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں انتقام اور ردِ انتقام کا زاویہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن روہیلوں کی سرزمین اور چولستان کے صحراؤں نے اب اس کے ہاں فلسفے کا زاویہ اُبھار دیا ہے۔ انور سدید کے نزدیک غلام الثقلین نقوی کا دیہات یکسر خیر کی علامت ہے اور انہوں نے اس کی تقدیس کا زاویہ ہی نہیں اُبھارا بلکہ جلی ہوئی مٹی کو کدال کے لمس سے آشنا کر کے اس کی تخلیقی قوت کو بھی آشکار کیا ہے۔ انور سدید کے اس تجزیے سے تو ہمیں اتفاق ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شیرا نمبردار" اور "چاند پور کی نینا" وغیرہ افسانوں میں غلام الثقلین نقوی نے انسانی رشتوں میں احترام کی جو فضا پیدا کی ہے اس تک اُن کی نظر نہیں گئی۔ ایک اور بات یہ کہ غلام الثقلین نقوی کے افسانوں میں بدی ایک منفعل قوت کے طور پر پیدا ضرور ہوتی ہے اور اس کی یلغار بھی بڑی معنی خیز ہے۔ اس زاویے سے بھی انور سدید کا مطالعہ محروم نظر آتا ہے تاہم ان کی اس کاوش اور محنت سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے رفیق حسین کے جنگلی افسانوں سے دیہات کی مزاجی کیفیات اور صادق حسین کے افسانوں سے فاضل قوت کو صرف کرنے کا انداز تلاش کیا ہے اور انہیں ان کے فن کی نمایاں خصوصیات میں شمار کیا ہے۔

اس کتاب میں انور سدید نے زمانی تقدیم و تاخیر کو پیشِ نظر نہیں رکھا، چنانچہ چند اور دیہات نگار، کے تحت انہوں نے حیات اللہ انصاری سے لے کر ایوب جوہر تک متعدد افسانہ نگاروں کے فن کو اجمال میں سمیٹ ڈالا ہے۔ میرے خیال میں اگر وہ دیویندر ستیارتھی، ابوالفضل صدیقی، محمد علی رودولوی اور فضل الرحمٰن خان کی دیہات نگاری کے لیے ایک ایک باب الگ لکھتے تو اس کتاب کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہو جاتا۔ انور سدید نے علاقائی دیہات نگاری کو خاص اہمیت دی ہے۔ تاہم ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ یو پی۔ بہار۔ پنجاب۔ مشرقی پاکستان۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان کی دیہات نگاری کے منفرد زاویے بھی علیحدہ ابواب میں مجتمع کیے جاتے۔ اس ضمن میں انور سدید کی اس

ہوبی ہ ، اعتراف ضروری ہے کہ انہوں نے دیہات کا مطالعہ صرف روائتی افسانے تک محدود نہیں رکھا بلکہ مشتاق قمر، محمد منشا یاد، سریندر پرکاش، جوگندر پال، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ اور نجم الحسن رضوی کی جدید افسانہ نگاری سے بھی دیہات کے امتیازی نقوش اور ان افسانہ نگاروں کا جدید رویہ دریافت کیا ہے اور اس عمل میں انہوں نے شہزاد منظر اور احمد زین الدین کے افسانوں تک بھی رسائی حاصل کی ہے جو مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کے دیہات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا چند باتیں کتاب کی تنقیص کے لیے پیش نہیں کی گئیں اور نہ ان کے اظہار سے اس کتاب کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انور سدید نے جس خلوص سے اپنے موضوع پر نگہہ دوڑائی ہے اس سے ان کے حسنِ مطالعہ کے علاوہ وسعتِ مطالعہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس اعتراف کی اجازت بھی دیجئے کہ دیہات کے بارے میں کئی افسانوں کی طرف انور سدید نے ہی ہماری راہنمائی کی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ کس افسانہ نگار نے اپنی تخلیقی اُپج سے دیہات کے زاویوں کو فنی خوبی سے پیش کیا اور کس افسانہ نگار نے دیہات کو محض فیشن کے طور پر قبول کیا، کس افسانہ نگار کے ہاں دیہات جزوِ حیات بنتا ہے اور کس افسانہ نگار نے اپنے کتابی علم کی بنا پر دیہات نگاری کا فریضہ سرانجام دے ڈالا۔ کون نئی راہیں تراشنے میں کامیاب ہوا اور کس نے تقلید کی راہ اختیار کی۔ بلاشبہ انور سدید نے اس کتاب کو حرفِ آخر شمار نہیں کیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب سے آگے تحقیق کی طرف قدم بڑھانے کے لیے شاید اتنے مطالعے کی توفیق بھی کسی کو نہ ہو اور انور سدید کی کتاب کو ہی حرفِ آخر کے طور پر قبول کر لیا جائے، خدا کرے کہ یہ مرحلہ شوق انور سدید کے انداز میں ہی طے ہو اور کوئی صاحب اس سے آگے بڑھنے کی سعی بھی کریں۔ یہ کتاب رائٹرز گلڈ الٰہ آباد نے بھارت سے شائع کی ہے۔ کتابت گنجان اور سادہ ہے، ضخامت ۱۹۲ صفحات ہے۔ اتنی خوبیوں کے باوصف کتاب کی قیمت صرف سولہ روپے مقرر کی گئی ہے جو بڑی مناسب نظر آتی ہے۔ اس کی علمی اور ادبی افادیت اور موضوع کی ندرت کے اعتبار سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا ایک پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا جائے اور اگر ڈاکٹر انور سدید دیہاتی افسانوں کا ایک انتخاب بھی مرتب کر دیں تو ان کی اس خدمت کو اہلِ ادب استحسان کی نظر سے دیکھیں گے۔

سجاد نقوی

قصّہ ایک مضمون کا

ڈاکٹر انور سدید یوں تو بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں لیکن ان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ادب کے میدان میں جب بھی غلط بیانی، دھاندلی یا کردار کُشی ہوتی ہے تو وہ فوراً اپنے ردِ عمل کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کے اس رویّے سے وہ لوگ جو حزبِ اختلاف کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے، ناراض ہو جاتے ہیں اور اپنے غم و غصّہ کا اظہار اپنے مضامین یا کالموں میں کرنے لگتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر انور سدید نے ان لوگوں کے غم و غصّہ کو کبھی اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ سچ کا پرچم ہی بلند کیا ہے۔ میں ماہ نامہ "اُردو زبان" کا "ڈاکٹر انور سدید نمبر" مرتّب کر رہا تھا کہ ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہوا جو میں قارئینِ "اُردو زبان" کے سامنے بطور مثال پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ وہ جان لیں کہ انور سدید ادب میں ہونے والی دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے موقعہ پر کس قسم کا کردار ادا کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہندوستان کے مشہور ادبی ماہنامہ "کتاب نما" کے شمارہ اگست ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ایک مضمون بعنوان "غزل گو" شائع ہوا جس میں ڈاکٹر موصوف نے اُردو کے جدید غزل گو شعرا کے بارے میں بڑے حتمی اور دو ٹوک انداز میں ایسے فیصلے سنائے تھے جو سخت قابلِ اعتراض تھے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ 'اوراق' کی صفوں ہی سے اُبھرے ہیں اور انہیں اوراق کے معاونین شمار کیا جاتا ہے۔ خود وزیر آغا صاحب نے بحیثیت مدیر 'اوراق' مرزا صاحب کے ادبی مستقبل میں ہمیشہ دلچسپی لی ہے۔ اس لیے جب انہوں نے مرزا صاحب کا مضمون "غزل گو" پڑھا اور کہ مرزا صاحب غلط راستے پر چل نکلے ہیں تو اصلاحِ احوال کے لیے مدیر "کتاب نما" کو ایک خط لکھا جو کتاب نما میں شائع کر دیا گیا۔ اس خط میں انھوں نہ صرف مرزا صاحب کے حتمی رویّے پر اعتراض کیا گیا بلکہ ظفر اقبال کی شاعری کے بارے میں مرزا صاحب کی رائے کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ بس یہی بات جناب ظفر اقبال صاحب کو بُری لگی۔ چنانچہ موصوف نے

مدیر کتاب "نما" کو خط لکھنے کے بجائے ایک کالم بعنوان "مؤدبانہ" جنگ لاہور" میں شائع کرادیا جو میں قارئین "اُردو زبان" کے مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں :۔

"اسلامک پبلک سکول ٹیکسلا سے ایک دوست نے کتاب نما" دہلی کے شمارہ اگست ۱۹۸۹ء میں چھپے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے ایک مضمون بعنوان "غزل گو" کا تراشہ جس میں راقم الحروف کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اسی جریدے کے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے گوشہ بعنوان "کھلے خطوط" میں شائع ہونے والے ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک خط کا تراشہ فوٹو سٹیٹ کرا کر بھجوایا ہے۔ قارئین کی دلچسپی اور تفنن طبع کے لیے تراشوں سے متعلقہ حصے :"شب خون" کے نئے غزل گو شعراء خصوصاً ظفر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، شہریار، عادل منصوری، محمد علوی اور بمل کرشن اشک نے غزل کے کلاسیکی مزاج کو رد کر کے غزل کا ایک نیا لحن ایجاد کیا اور انفرادی سطح پر ان کی پہچان بھی ممکن ہو سکی لیکن کیا آج ہم اس تازہ لحن کو ظفر اقبال کے علاوہ کوئی اور نام دے سکتے ہیں؟"

۲۔ "نئی شاعری اور شب خون کے بیشتر خفتہ ناموں کے علاوہ کمار پاشی، اسلم انصاری، ساقی فاروقی مراتب اختر اور نذیر قیصر اپنے محدود تر شعری دائرے کے پابند رہے اور ہمارے بہت بڑے غزل گو ظفر اقبال نے "گل آفتاب" اور "رطب و یابس" مکمل کر کے ہی دم لیا۔ اس وقت جی چاہتا تھا کہ کاش ظفر اقبال آب رواں کے تسلسل میں اپنا شعری سفر طے کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظفر اقبال اتنا طاقتور نکلا کہ بہت کچھ نئی شاعری پر خرچ کر چکنے کے بعد بھی اس کے پاس وہ کچھ بچ رہا جو اس کے دیگر معاصرین کے نصیب میں نہیں۔"

۳۔ "دیکھا اور سوچا جائے کہ ترقی پسند غزل، نئی غزل، جدید غزل اور جدید ترین غزل نے ہماری غزل کے کلاسیکی مزاج سے بغاوت کی تھی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۰ء یعنی اقبال ساجد کی مضحکہ خیزی میں درجۂ کمال تک پہنچنے کے ۳۴ برسوں میں مکمل فیض، نصف احمد ندیم قاسمی، نصف مخدوم محی الدین، نصف مجروح سلطان پوری اور نصف مصطفیٰ زیدی کُل پانچ شاعر نصیب ہوئے جب کہ یاس یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری کے بعد کلاسیکی مزاج کی پروردہ غزل سے حفیظ ہوشیارپوری، انجم رومانی، باقی صدیقی، ناصر کاظمی، عزیز حامد مدنی، منیر نیازی، محشر بدایونی، سلیم احمد، احمد مشتاق، محبوب خزاں، انور شعور، جون ایلیا اور سب سے بڑھ کر آب رواں والا ظفر اقبال تیرہ ایسے شعرا ملے جن میں سے ہر ایک کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے فیض کے علاوہ اوّل الذکر شعرا سے بڑھ کر ہیں۔

۴۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی گرد اڑانے اور نئے پرانے کا جھگڑا اکھڑا کر کے ہاتھ کیا آیا؟

ترقی پسندوں میں فیض، ندیم، مجروح اور مصطفیٰ زیدی ہی کی غزل کیوں معتبر ٹھہری؟ نئے شعراء کی بہت بڑی تعداد میں ظفر اقبال ہی کیوں قابلِ اعتبار رہا؟ جدید اور جدید تر غزل کی بھیڑ میں شکیب جلالی کی پندرہ غزلیں ہی کیوں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں؟"

۵۔ اب ڈاکٹر وزیر آغا کے خط سے متعلقہ حصہ ملاحظہ ہو۔

"کتاب نما" کا دوسرا قابلِ ذکر مضمون ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا "غزل گو" ہے۔ اصلاً یہ مضمون غلام حسین ساجد کی غزل سے متعلق ہے اور غالباً ساجد صاحب کی کتاب کی رونمائی کے سلسلے کا ایک مضمون ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کا بڑا حصہ ترقی پسند غزل، نئی غزل، جدید غزل اور جدید تر غزل کے شعراء کے لیے مختص کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض ایسی چونکا دینے والی باتیں کہیں ہیں جن سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا۔ اصولاً اس قسم کے مضمون میں (سٹیٹ منٹ کیٹگریکل) سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔ اگر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ایسا کرتے تو پھر کلاسیکی مزاج کی پروردہ غزل کے صرف تیرہ شعراء کا نام لے کر ان متعدد شعراء کو مسترد نہ کرتے جو اس خاص میدان میں ان تیرہ شعراء سے کسی طور بھی کم مرتبہ نہیں رکھتے بلکہ اگر موازنہ کیا جائے تو یہ شاید بہتر ہی ثابت ہوں۔ مثلاً اس فہرست میں شہزاد احمد، ریاض مجید، کشور ناہید، حامد سروش، افتخار عارف، احمد ظفر، خورشید رضوی، ساقی فاروقی، عارف عبدالمتین اور متعدد دیگر بہت اچھے شعراء کا نام نہیں ہے۔ یہ محض صرف پاکستان کی حد تک نام لیے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والے جدید پاکستانی غزل گو شعراء میں رشید قیصرانی، ضیاء شبنمی، نصیر احمد ناصر، اکبر حمیدی، جلیل عالی، سبط علی صبا، ریاض رام، حیدر قریشی، سیما شکیب، اظہر ادیب، مسلم کولسری، انجم نیازی وغیرہ کا نام تو نہیں لیا۔ لیکن ان سے کم تر درجے کے شعراء کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی ان کا انداز حتمی اور فیصلہ کن ہے جس سے زیادہ تر تلخیاں ہی جنم لیں گی۔ ظفر اقبال کی غزل کے سلسلے میں ان کے دل میں کچھ زیادہ نرم گوشہ موجود ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ "آبِ رواں" کے بعد ظفر اقبال کی شاعری کا گراف بتدریج سر بسجود ہوتا چلا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک بڑا حصہ سبک ہندی کی سطح سے اُوپر نہیں اٹھ پایا۔ میری ناچیز رائے میں وہ زیادہ سے زیادہ غزل کے ایک درمیانے درجے کے شاعر ہیں۔ دوسرے متعدد بہت اچھے شعراء کے مقابلے میں صرف ظفر اقبال کو "قابلِ اعتبار شاعر" قرار دینا لفظ "اعتبار" کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سول لائنز سرگودھا (پاکستان)

۶۔ "ڈاکٹر وزیر آغا صاحب جو نہ صرف مکتوب میں اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا ضروری خیال کرتے ہیں بلکہ "اجتناب ہی کرنی چاہئے۔" لکھ کر اجتناب کو مؤنث بار بار بھتے ہیں، میری غزل کے بارے میں منفی رائے دینے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔ بے شک وہ ذاتی وجوہ کی بنا پر ہی کیوں نہ ہو، تاہم خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے اہل الرائے نقاد نے اپنے بارے میں میری کم و بیش دس سالہ اختلافی آراء کے بعد پہلی بار میرے بارے میں کھل کر اظہار رائے کیا ہے اگرچہ ایک غیر ملکی پرچے میں کیونکہ اندرون ملک وہ یہ نیک مقصد ڈاکٹر انور سدید اور دیگر مصاحبین کے ذریعے حاصل کرتے رہے ہیں۔ موصوف کے مجموعہ غزل بعنوان "غزلیں" مطبوعہ مئی ۱۹۷۳ء کے صفحہ ۱۱۰ پر ذوالفقار احمد تابش "پس منظر" کے عنوان کے تحت ہیں کہ

"ہمارے عہد میں غزل نے بڑی تیزی سے تبدیلیاں قبول کی ہیں اور مختلف تجربوں کی کٹھالی سے گزر رہی ہے۔ لہٰذا اب غزل کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل ہمیں اپنے مستقل پیمانوں میں تبدیلی لانا ہو گی...... شاد عارفی، مجید امجد، ناصر کاظمی، (تجرباتی غزلیں) ظفر اقبال اور نوجوان شعراء کی غزل کا مطالعہ اب ہمیں نئے انداز سے کرنا ہو گا۔"

۷۔ اب زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تابش کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے میری غزل کا مطالعہ بھی نئے انداز سے کر ڈالا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے تو از راہ کرم مجھے دوسرے درجے کا شاعر قرار دیا ہے حالانکہ میں اپنے آپ کو تیسرے درجے کا شاعر سمجھتا ہوں کیونکہ اول درجے کا کوئی شاعر آج تک میری نظر سے گزرا نہیں اور دوسرے درجے کے جملہ شعراء مجھ سے بہتر ہیں۔ اس لیے "اپنے اندر زیادہ تر تلخیوں ہی کو جنم دینے" کی بجائے بہتر ہو گا کہ وہ اپنے کام میں مگن رہیں اور اس بات کی پرواہ ہرگز نہ کریں کہ ان کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے۔"

جب "جنگ لاہور" میں ظفر اقبال کی یہ تحریر چھپی جو اپنے لہجے کے اعتبار سے بھی قابلِ اعتراض تھی تو ڈاکٹر انور سدید سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ اصلاحِ احوال کے لیے لکھے گئے ایک سینئر ادیب کے خط پر ایک کالم نگار شاعر کے ایسے تلخ اور ترش رویہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً جنگ لاہور کو ایک خط لکھ دیا۔ ہر بار جب کسی ادیب کی توہین ہوتی ہے تو انور سدید اپنے ردِ عمل کا اسی طرح فوری اظہار کرتے ہیں چاہے وہ ادیب ان کا دوست ہو یا دشمن! اب ڈاکٹر انور سدید صاحب کا یہ خط ملاحظہ

فرمائیے:

"۲/۱۷ ایستلیج بلاک، اقبال ٹاؤن
لاہور — ۱۳؍دسمبر ۱۹۸۹ء

محترمی حسن رضوی صاحب السلام مسنون

جنگ (جریدۂ ادب - ۱۲؍دسمبر) میں محترم ظفر اقبال کا کالم "مودبانہ" پڑھا۔ مقالہ "غزل گو" مطبوعہ کتاب نما" دہلی (اگست ۸۹) کے بارے میں وزیر آغا صاحب نے لکھا تھا کہ" مصنف کا انداز حتمی اور فیصلہ کُن ہے جس سے زیادہ تر تلخیاں ہی جنم لیں گی۔"

انہوں نے مقالہ نگار کو مشورہ دیا تھا کہ اس قسم کے مضمون میں اصولاً کیٹیگریکل سٹیٹمنٹ سے اجتناب ہی برتنا چاہیے۔ مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ فاضل مصنف نے اس مشورے کو قبول کیا ہے یا نہیں۔ لیکن پہلی بات درست ثابت ہوئی۔ تلخی کا بیج ظفر اقبال صاحب کے دل سے پھوٹا جواب شاعری اور وکالت کے بجائے کالم نگاری میں سکہ جما رہے ہیں۔ سیاست سے اکتائے ہوئے لوگوں کا دل پرانے لطیفوں سے بہلاتے ہیں۔

تازہ "مؤدبانہ" کی وجہ تصنیف غالباً یہ ہے کہ وزیر آغا نے ظفر اقبال کے بارے میں مقالہ "غزل گو" میں پیش کی گئی رائے سے معمولی اور بے ضرر سا اختلاف کیا ہے اور متعدد جدید غزل گوؤں کے ہجوم میں ظفر اقبال کو درمیانے درجے (انٹر کلاس) کا شاعر قرار دیا ہے۔ بس اسی سے ظفر اقبال صاحب بھڑک اٹھے اور کتابت کی اغلاط پر بھی دُرّہ بازی کرنے لگے۔ اپنی وکالت کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دے ڈالا۔ حالاں کہ کوئی وکیل یہ کام خود نہیں کرتا۔ انکسار اتنا اختیار کیا کہ اپنے آپ کو تیسرے درجے کا شاعر قرار دے دیا۔ یہ ظفر اقبال کی خود اپنے ساتھ زیادتی ہے۔ مَیں اسے قبول کرنے سے قاصر ہوں اور ان کے خلاف اس رائے دہی پر احتجاج کرتا ہوں۔ وہ تیسرے درجے کے شاعروں سے یقیناً بلند ہیں۔ "آبِ رواں" میں ان کی شاعری نے لوگوں کو جھنجوڑ ڈالا تھا اور یہ لوگ اب تک جھنجوڑے ہوئے ہیں، وزیر آغا بھی "آبِ رواں" کی غزلوں کے معترف ہیں اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے بھی لکھا ہے کہ "کاش ظفر اقبال "آبِ رواں" کے تسلسل میں اپنا سفر طے کرے۔"

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ "اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"۔
نتیجہ "گل آفتاب" اور "رطب و یابس" کی ناشاعری جو ترقیِ معکوس بھی نہیں بلکہ زوال درد آشنا ہے۔

حسن رضوی صاحب! انٹر کلاس بڑا خطرناک درجہ ہے۔ اس میں سفر کرنے والا کسی وقت بھی درجہ دوم اور درجہ اوّل میں چلا جاتا ہے۔ اور حالات معاونت نہ کریں تو تیسرے درجے میں بھی سفر کر لیتا ہے۔ ظفر اقبال صاحب بھی تیسرے درجے میں آ گئے ہیں تو میں خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ "رطب و یابس" کے بعد کبھی تو اوپر کے درجے کی طرف آئیں گے لیکن یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اور اب تو وہ بہت جونیئر ادبا کی مرتبانہ اور فیاضانہ آرا پر انحصار کرنے لگے ہیں تو دوسری طرف حقیقتِ اظہار پر لڑنے لگے ہیں —— ایک حالیہ واقعہ سنیئے:

اظہر جاوید کی تقریب میں اشفاق احمد اسلم کمال کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک بزرگ ادیب کے رویّے کے بارے میں امجد اسلام امجد سے پوچھا۔ امجد صاحب نے کچھ یوں کہا کہ "یہ ادیب اب رحم کے مقام پر ہیں"۔

— کیا ظفر اقبال بھی اس مقامِ بلند پر پہنچ گئے ہیں؟ —— مجھے تو وہ جوان اور حوصلہ مند نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کس حوصلہ مندی سے شاعری کی قربانی دی ہے۔ واہ وا ——

کتابت کی اغلاط کے سلسلے میں عرض ہے کہ وزیر آغا کا جملہ کتاب نما میں یوں چھپا ہے: "ان (ظفر اقبال) کی غزلوں کا ایک بڑا حصّہ تنگ بندی کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھ پایا"۔

ظفر اقبال صاحب نے اپنے اقتباس "جنگ" میں "تنگ بندی" کو "سبک ہندی" بنا دیا حالانکہ زیادہ بامعنی "تنگ بندی" نظر آتا ہے۔ اب دیکھئے جملہ کتنا بامعنی ہو گیا ہے۔

"ان کی غزلوں کا ایک بڑا حصّہ تنگ بندی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پایا"۔

ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وزیر آغا اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کبھی نہیں لکھتے یہ اضافہ مدیر "کتاب نما" کا ہے۔ ویسے انہوں نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لے رکھی ہے۔ کیا ڈاکٹر کا نام کے ساتھ لکھنا خلافِ شرع ہے؟

مجھے تو ڈاکٹر مرزا حامد بیگ پر غصّہ آ رہا ہے۔ انہوں نے ظفر اقبال کو عادل منصوری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ انہیں محمد علوی کے ساتھ تو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ

دونوں ظفر صاحب سے ایک لحاظ سے بلند بھی ہیں کہ وہ جونیئر ادیبوں سے رائے کی زکوٰۃ نہیں مانگتے ۔ ظفر اقبال تو اب اس کے بھی محتاج ہو گئے ہیں ۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی زیادتی یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک بزرگ کو نصف شاعر کہا ہے اور ظفر اقبال کی کیفیت کو کمیت کا غلام بنا دیا ہے ۔ ان کے مقالے کی بہت سی باتیں صحت طلب ہیں ۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خالد اقبال یاسر کے نام کے بعد وغیرہ وغیرہ نہیں لکھا ۔ وگرنہ ذم کا پہلو پیدا ہوتا اور مجھے دکھ پہنچتا ۔ جگہ زیادہ ہوتی تو میں بات کو آگے بڑھاتا ۔ آخری چار شاعروں پر بحث کرتا لیکن اب اجازت دیجئے ۔

انور سدید

چونکہ میں انور سدید صاحب سے تقریباً سوا سو میل کے فاصلہ پر رہتا ہوں اس لیے مجھے ان کے خط کا کوئی علم نہیں تھا جو انہوں نے جنگ لاہور کو لکھا ۔ کچھ عرصہ سے ڈاکٹر انور سدید صاحب کی صحت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ شاید علالت کے باعث وہ ظفر اقبال کے کالم کا جواب نہ دے سکے ہوں ۔ محض ریکارڈ کی درستی کے لیے خود بھی ایک خط مدیر جنگ کو لکھ دیا جو میں اب قارئینِ اُردو زبان کی دلچسپی کے لیے "شاملِ تفتیش" کرتا ہوں:

۳۲ - مراد آباد کالونی، سرگودھا
۱۸ دسمبر ۱۹۸۹ء

محترمی حسن رضوی صاحب!

السلام علیکم ۔ روزنامہ "جنگ" لاہور کے پچھلے ہفتے کے ادبی صفحہ پر آپ نے جناب ظفر اقبال کی ایک تحریر شائع کی ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کے اس مراسلے کے جواب میں ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے "کتاب نما" دہلی میں شائع ہوا تھا ۔ اس مراسلے میں آغا صاحب نے مرزا حامد بیگ صاحب کے ایک مضمون کی بعض آراء سے اختلاف کیا تھا ۔ اصولاً ظفر اقبال صاحب کو آغا صاحب کے مراسلے کا جواب "کتاب نما" ہی میں دینا چاہیے تھا مگر اس کے لیے انہوں نے "جنگ" لاہور کو استعمال کیا جو مجھے اچھا نہیں لگا ہے ۔ اگر ظفر اقبال صاحب اپنی یہ تحریر "کتاب نما" کو اشاعت کے لیے بھیجتے تو مجھے یقین ہے کہ مدیر "کتاب نما" خود ہی موصوف کے ان دونوں اعتراضات کا جواب دیتے جو موصوف نے ڈاکٹر وزیر آغا کے مراسلے پر کئے ہیں ۔ مثلاً ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وزیر آغا صاحب نے اپنے مراسلے میں اپنے نام کے ساتھ

لفظ "ڈاکٹر" لکھا ہے۔ یہ اعتراض مجھے بڑا عجیب سا لگا ہے۔ اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ وزیر آغا نے کبھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ نہیں لگایا۔ (آغا صاحب کے مضامین، "اوراق" اور خطوط اس بات کے گواہ ہیں) بلکہ "اوراق" کے پیڈ پہ ان کا نام تک درج نہیں ہوتا۔ اور ذاتی پیڈ تو اب تک انہوں نے چھپوایا ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدیر "کتاب نما" نے ازرہِ احترام ڈاکٹر کا لفظ وزیر آغا کے نام کے ساتھ لکھ دیا تھا۔ اگر جناب ظفر اقبال اپنی تحریر بجائے جنگ کو بھیجنے کے "کتاب نما" کو ارسال کرتے تو اشاعت کی صورت میں مدیر "کتاب نما" فٹ نوٹ میں صورتِ احوال کی ضرور وضاحت کر دیتے۔

ظفر اقبال صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وزیر آغا صاحب نے اپنے مراسلے میں لفظ اجتناب مؤنث باندھا ہے۔ اس اعتراض کا جواب بھی مدیر "کتاب نما" ہی دے سکتے تھے جن کی تحویل میں آغا صاحب کا اصل مراسلہ ہے۔ اس مراسلے میں "تنگ بندی" کے بجائے "سبک ہندی" کی ترکیب بھی غلط کتابت ہوئی ہے۔۔ میں حیران ہوں ظفر اقبال صاحب نے تنگ بندی اور سبک ہندی کو ایک دوسرے کا کیسے مترادف سمجھ لیا ہے جب کہ ان کے معانی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ 'اجتناب' کو مؤنث استعمال کرنے کی کتابت کی غلطی تو ظفر اقبال صاحب کو آغا صاحب کی غلطی نظر آئی مگر سبک ہندی کی فاش غلطی سے وہ اس لیے صرفِ نظر کر گئے کہ تنگ بندی کے آئینہ میں انہیں اپنی شاعری کی تصویر دکھائی دی۔ اگر جناب ظفر اقبال کی نیت نیک ہوتی تو وہ اس قسم کا بے معنی اعتراض کرنے سے پہلے وزیر آغا صاحب کی تحریروں پہ ایک نظر ڈال سکتے تھے جن میں "اجتناب" کا لفظ بار ہا استعمال ہوا ہے لیکن جب مقصد پگڑی اچھالنا ہو تو اس قسم کی تحقیق کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

اپنے اس کالم میں ظفر اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ کتاب کا تراشہ انہیں کسی دوست نے ارسال کیا ہے۔ کیوں بھیجا ہے؟ اس کا بھی انہیں علم ہونا چاہئے تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ظفر اقبال صاحب بڑے زُود رنج ہیں اور بہت جلد طیش میں آ کر ناشائستہ زبان استعمال کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا تراشہ بھیجنے والے نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان سے آغا صاحب کے خلاف ایک کالم لکھوا لیا ہے۔ زہی ظفر اقبال صاحب کی شاعری کے

بارے میں وزیر آغا صاحب کی رائے تو یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں ایسا کیا ہو۔ پچھلے دس برسوں میں انہوں نے کئی موقعوں پر جناب ظفر اقبال کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ابتدا اچھی تھی مگر اس کے بعد ان کی شاعری کا گراف بتدریج گرتا چلا گیا۔ مزے کی یہ بات بھی ہے کہ ہر بار جب آغا صاحب نے ظفر اقبال صاحب کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا تو ظفر اقبال صاحب نے طیش میں آ کر ان کے خلاف ایک کالم ضرور لکھا بلکہ اس کے علاوہ بھی انہیں جب کبھی موقع ملتا ہے آغا صاحب کے خلاف وہ غیر پارلیمانی زبان ضرور استعمال کرتے ہیں جو ان کا ایک نفسیاتی مسئلہ لگتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر وزیر آغا صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ ظفر اقبال درمیانے درجے کے شاعر ہیں۔ جنگ کے اس کالم میں جناب ظفر اقبال نے سچ بولتے ہوئے خود کو درمیانے درجے کا نہیں بلکہ تیسرے درجے کا شاعر کہا ہے اور مجھے اس سلسلے میں وزیر آغا سے نہیں بلکہ ظفر اقبال صاحب سے اتفاق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب ظفر اقبال کا اصل میدان غزل گوئی نہیں کالم نگاری ہے۔ گو بد قسمتی سے اس میدان میں بھی وہ تیسرے درجے ہی کے کالم نگار نظر آتے ہیں۔ آخر مشفق خواجہ، انتظار حسین، منّو بھائی، نذیر ناجی، عبد القادر حسن اور دوسرے لوگ بھی تو کالم لکھتے ہیں۔ ان کے کالموں کے مقابلے میں جناب ظفر اقبال کے لٹھ بردار کالموں کی بھلا حیثیت ہی کیا ہے۔ فقط والسّلام

مخلص سجّاد نقوی

میں نے یہ سارا قصہ محض ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ انور سدید صاحب کی زندگی میں ایسے لاتعداد واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اگر موقعہ ملا تو میں ان واقعات کو جمع کر کے کتابی صورت میں پیش کروں گا تاکہ ادب میں دلچسپی لینے والوں کو معلوم ہو سکے کہ اس "ہنگامۂ دار و گیر" میں کم از کم ایک شخص تو ہے جو ہر قسم کی ادبی دھاندلی یا بد عنوانی کا نوٹس لیتا ہے۔ اور اس معاملے میں کسی ادبی وڈیرے سے خوف زدہ نہیں ہے!

ڈاکٹر سید عبداللہ

"پہلے مجھے یہ بتائیے کہ آپ کھاتے پیتے اور سوتے کس وقت ہیں۔ کیوں کہ جس رفتار سے آپ کی معلومات افزا اور نادر کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے پینے اور سونے کے وقت کچھ نظر نہیں آتا۔ بسیار نویسی اور نغز نگاری کا امتزاج اگر کہیں دیکھنا ہو تو وہ انور سدید کے پاس ہے۔"

(ایک مکتوب سے اقتباس)

مرزا محمد منور

"انور سدید نے اردو ادب کا بڑی محنت و کاوش سے مطالعہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سوجھ بوجھ سے بھی نوازا ہے، ہمت کی دولت بھی فراواں بخشی ہے۔ میری نظروں میں انور سدید اردو ادب کے فرہاد نا آشنا فرہاد ہیں۔"

انتظار حسین

"ظاہر میں تو یہی لگتا ہے کہ انور سدید کا مشغلہ بس قلمی لڑائیاں لڑنا ہے۔ مگر شاید ایسی بات نہیں ہے قلمی لڑائیوں کا شوق اپنی جگہ۔ سنجیدہ غور و فکر اور تحقیق و تدقیق اپنی جگہ۔"

ڈاکٹر [illegible] بخاری

"انور سدید اردو ادب کا راست باز اور بے باک [illegible] ہے۔ [illegible] خلوص اور صداقت میں ڈوبا ہوتا ہے [illegible] ہر فیصلہ بے لاگ اور دو ٹوک ہوتا ہے اور یہ بات [illegible] ہر تنقیدی مقالہ کہتا ہے۔"

[illegible]

"انور سدید کی [illegible] شان جھلکے میں یقین رکھتی [illegible] ان کو جس خطاب [illegible] قبول کر لیتے ہیں۔ انور سدید [illegible] کا آدمی سمجھتے ہیں، جو [illegible] کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے۔"

[illegible]

"انور سدید جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں پہلے [illegible] کے ساتھ اس کے سبھی گوشوں [illegible] نظروں سے نوازتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع میں کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔"

★★★★★★★★★★